سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مُدیر: خرّم مُراد

ادارۂ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خرم مراد

جلد ۱۲۲ جولائی ۱۹۹۶ء صفر / ربیع الاول ۱۴۱۷ھ عدد ۷

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ 'ملتان روڈ' لاہور ۵۴۵۷۰

فون: ۷۵۷۰۱۲۴

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵-اے ذیلدار پارک 'اچھرہ' لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۱۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ -/۱۵ روپے

زر سالانہ -/۱۵۰ روپے

مشرق وسطیٰ -/۵۵۰ روپے

بنگلہ دیش 'مسقط -/۴۵۰ روپے

بھارت -/۳۰۰ روپے

یورپ 'مشرق بعید -/۶۵۰ روپے

امریکہ 'کینیڈا' آسٹریلیا -/۹۰۰ روپے

○

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

سرسید احمد خاں مرحوم و مغفور کی قیادت میں علی گڑھ سے جو تعلیمی تحریک اٹھی اس کا وقتی مقصد یہ تھا کہ مسلمان اس نئے دور کی ضروریات کے لحاظ سے اپنی دنیا درست کرنے کے قابل ہو جائیں تعلیم جدید سے بہرہ مند ہو کر اپنی معاشی اور سیاسی حیثیت کو تباہی سے بچالیں' اور ملک کے جدید نظم و نسق سے استفادہ کرنے میں دوسری قوموں سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ اس وقت اس سے زیادہ کچھ کرنے کا موقع نہ تھا۔ اگرچہ اس تحریک میں فوائد کے ساتھ نقصانات اور خطرات بھی تھے۔ مگر اس وقت اتنی مہلت نہ تھی کہ غور و تفکر کے بعد کوئی ایسی محکم تعلیمی پالیسی متعین کی جاتی جو نقصانات سے پاک اور فوائد سے لبریز ہوتی۔ نہ اس وقت ایسے اسباب موجود تھے کہ اس نوع کی تعلیمی پالیسی کے مطابق عمل در آمد کیا جا سکتا۔ لہٰذا محض وقتی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کو اسی طرز تعلیم کی طرف دھکیل دیا گیا جو ملک میں رائج ہو چکا تھا' اور خطرات سے بچنے کے لیے کچھ تھوڑا سا عنصر اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی رکھ دیا گیا جس کو جدید تعلیم اور جدید تربیت کے ساتھ قطعاً کوئی مناسبت نہ تھی۔

یہ صرف ایک وقتی تدبیر تھی جو ایک آفت ناگہانی کا مقابلہ کرنے کے لیے فوری طریق پر اختیار کر لی گئی تھی۔ اب وہ وقت گذر چکا ہے جس میں فوری تدبیر کی ضرورت تھی' وہ فائدہ بھی حاصل ہو چکا ہے جو اس تدبیر سے حاصل کرنا مقصود تھا' اور وہ خطرات بھی واقعہ کی صورت میں نمایاں ہو چکے ہیں جو اس وقت صرف موہوم تھے۔ اس تحریک نے ایک حد تک ہماری دنیا تو ضرور بنا دی' مگر جتنی دنیا بنائی اس سے زیادہ ہمارے دین کو بگاڑ دیا۔ اس نے ہم میں "کالے فرنگی" پیدا کیے۔ اس نے ہم میں "اینگلو محمڈن" اور "اینگلو انڈین" پیدا کیے اور وہ بھی ایسے جن کے نفسیات میں "محمڈن" اور "انڈین" کا تناسب بس برائے نام ہی ہے۔ اس نے ہماری قوم کے طبقہ علیا اور طبقہ متوسط کو' جو دراصل قوم کے اعضائے رئیسہ ہیں' باطنی و ظاہری دونوں حیثیتوں سے یورپ کی مادی تہذیب کے ہاتھ فروخت کر دیا' صرف اتنے معاوضہ پر کہ چند عہدے' چند خطاب اور چند کرسیاں ایسے لوگوں کو مل جائیں جن کے نام مسلمانوں سے ملتے جلتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اب دائما ہماری یہی تعلیمی پالیسی رہنی چاہیے؟

(سید ابوالاعلیٰ مودودی' اشارات' جلد ۸' عدد ۵' جمادی الاول ۱۳۵۵ھ' جولائی ۱۹۳۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش میں اصل فیصلہ کن مسئلہ

کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ' اللہ کے رسولؐ ہیں؟

خرم مراد

آج جب کہ مغرب مسلسل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف طبل جنگ بجا رہا ہے' اور دنیا کو مستقبل میں اسلام اور مغرب کے درمیان ایک زبردست تہذیبی معرکہ (clash of civilizations) برپا ہونے کی خبر دے رہا ہے' ساتھ ہی وہ اپنی طرف سے اس جنگ کے لیے پوری تیاریاں بھی کر رہا ہے' اور جو کچھ پیش قدمیاں اس وقت کرنا ممکن ہیں' وہ بھی کر رہا ہے' مسلمانوں کے لیے یہ سمجھنا بڑا اہم اور ضروری ہے کہ وہ اصل مسئلہ کیا ہے جس کے گرد یہ تہذیبی جنگ لڑی جا رہی ہے' اور اس جنگ میں فیصلہ کن حیثیت کس ایشو اور کس میدان کو حاصل ہے۔ اس سوال کا صحیح جواب' صحیح سوچ' حکمت عملی اور ترجیحات اختیار کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔

شاید کم ہی لوگ ہوں گے جنھیں اس بات کا ادراک ہو یا جو اسے آسانی سے تسلیم کر لیں' لیکن ہمیں اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اصل اور فیصلہ کن ایشو اور مسئلہ' رسالت محمدیؐ کی صداقت کا ایشو اور مسئلہ ہے۔ کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں؟ حرا کے بعد' روز اول بھی یہی سوال تھا جو اصل موضوع نزاع و جدل تھا' اور آج بھی یہی ہے۔ اس وقت بھی انسان اسی بات کے ماننے اور نہ ماننے پر دو کیمپوں میں تقسیم ہو گئے تھے' اور ان کے جواب نے قوموں کے مقدر اور تاریخ و تہذیب کے رخ کا فیصلہ کر دیا تھا' آج بھی اسی سوال پر مستقبل کا مدار ہے۔ یہ کشمکش تو ازلی و ابدی ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

مغرب کے معاشی' سیاسی اور اسٹرے ٹیجک مفادات کا مسئلہ بھی یقیناً اہم ہے' تیل کے چشمے بھی اہم ہیں۔ اسی لیے اس نے عالم اسلام کے قلب میں اسرائیل کا خنجر گھونپا ہے' مسلمان حکمرانوں کو

اپنا باج گزار بنایا ہے' مشرق وسطیٰ میں فوجی اڈوں کا جال بچھا لیا ہے' مسلمان ملکوں کو کمزور اور بے طاقت کر رہا ہے' یا جن سے سرتابی کا شبہ ہے ان کے گلے میں پھندا کس رہا ہے۔ لیکن مفادات کے تنازعات تو امریکہ' یورپ' جاپان' چین اور روس کے درمیان بھی ہیں' ان کی بنا پر ان کے درمیان مستقل دشمنی اور ایک دوسرے کی بربادی کے مشورے اور منصوبے نہیں۔ دراصل مسئلہ مفادات کا نہیں' یہ ہے کہ یہ مفادات ان لوگوں اور علاقوں میں واقع ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا ہیں' اور ان کے دین کے لیے مرنے کو زندگی سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ تہذیبی ایشوز کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے۔ اسی لیے انسانی حقوق کی دہائی ہے' عورتوں کے مقام' ان کی خود اختیاری (empowerment) اور آزادی (liberation) پر اصرار ہے' اسلامی قوانین اور حدود کے خلاف دباؤ ہے' جمہوریت دشمن ہونے کا الزام ہے۔ لیکن دنیا میں بڑی بڑی آبادیاں اور بھی ہیں جو مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ ان ساری مزعومہ تہذیبی اقدار کی خلاف ورزی کی مجرم ہیں اور ان ''تحائف'' کی مستحق۔ ظاہر ہے کہ اصل لڑائی ان تہذیبی ایشوز پر بھی نہیں' بلکہ یہ ایشوز تو اس تہذیب کی بربادی کے لیے لاٹھی کا کام کر رہے ہیں' جس کی تولید و ترکیب اور ترتیب و تکوین رسالت محمدیؐ کے دم سے ہے۔

مغرب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ مسلمان آج اتنے کمزور ہیں کہ سیاسی' معاشی اور فوجی لحاظ سے کسی طرح بھی وہ ان کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ اگر مسلمان اپنے نظام معاشرت و سیاست اور جرم و سزا کی تشکیل اسلام کے مطابق کریں' حجاب اختیار کریں یا حدود نافذ کریں' تو بھی اس کی تہذیب کو کوئی گزند نہیں پہنچتا۔ لیکن وہ مسلسل اس بات کی رٹ لگائے جا رہا ہے کہ اسلام کا احیا اور مسلمان -- اس کے الفاظ میں فنڈ امنٹلزم -- مغرب کی تہذیب' اس کے طرز زندگی' اس کی اقدار اور اس کی آج تک کی حاصل کردہ تہذیبی ترقی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے' ایسا کیوں ہے؟ رسالت محمدیؐ کی وجہ سے!

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے یدبیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں
الحذر آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر — حافظِ ناموسِ زن' مرد آزما' مرد آفریں

عام مسلمان اگر تہذیبی جنگ کی اس حقیقت سے بے خبر ہیں' تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ جو احیائے اسلام کے علم بردار ہیں' وہ بھی اس حقیقت کا پورا ادراک و احساس نہیں رکھتے۔ اسی لیے رسالت محمدیؐ کا ان کے ایجنڈے پر وہ مقام نہیں جو ہونا چاہیے۔ حالانکہ تہذیبی جنگ دل اور زندگی جیتنے کی جنگ ہے۔ دل پہلے بھی حضورؐ کی محبت سے مجتمع اور توانا ہوئے تھے' آج

بھی اسی سے ہوں گے۔ اس کے باوجود رسالت محمدیؐ کے لیے انسانوں کے دل اور ان کی زندگیاں مسخر کرنے کے لیے جو کچھ کرنا چاہیے وہ نہیں کیا جا رہا۔ یہی کچھ کرنے کا احساس اور جذبہ و فکر پیدا کرنا آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

رسالت محمدیؐ کے خلاف یورپ کی یہ جنگ کوئی نئی جنگ نہیں۔

جب سے اسلام اور عیسائیت کا آمنا سامنا ہوا ہے، اس وقت سے عیسائیت اور یورپ نے اسلام کے خلاف اپنی جنگ کا مرکز و محور ذات محمدیؐ اور رسالت محمدیؐ کو بنایا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا اچانک صحرائے عرب سے نمودار ہوئے، اور پلک جھپکتے میں انھوں نے شام، فلسطین، مصر، لیبیا، تیونس اور الجیریا پر ___ جو عیسائیت کے گڑھ تھے ___ قبضہ کر لیا۔ نہ صرف قبضہ کر لیا، بلکہ آبادیوں کی آبادیاں رسالت محمدیؐ کی تابع بن گئیں۔ یہی نہیں، ہزار سال تک اس کا سورج نصف النہار پر چمکتا رہا، اور ان کی ہزار بد دعاؤں، خواہشوں اور عملی کوششوں کے باوجود، وہ ڈھلنے پر نہ آیا۔ وہ متحیر، شکست خوردہ اور غیظ و غضب کا شکار تھے۔ مزید غصے کی بات یہ تھی کہ ان کی کرسٹالوجی (سیدنا مسیحؑ کی ابنیت / ولدیت اور مصلوبیت) اور شریعت کی عدم پابندی کے علاوہ دین محمدیؐ میں کوئی چیز ان کی عیسائیت سے خاص مختلف نہ تھی، بلکہ دونوں میں بڑی یکسانیت تھی۔ وہ حیران و ششدر تھے کہ اس غیر معمولی واقعے کی توجیہ کیا اور کیسے کریں، اس کا مقابلہ کیسے کریں، عیسائیوں کو مسلمان بننے سے کیسے روکیں؟

ان کو یہی نظر آیا کہ اس سارے "فتنے" کی جڑ، اور ان کی ساری مصیبت کا سبب، حضورؐ کی رسالت ہے۔ مسلمانوں کی قوت و شوکت کا راز حضورؐ پر ایمان و یقین اور آپؐ کی ذات سے والہانہ محبت اور وابستگی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنا سارا زور یہ بات ثابت کرنے پر لگا دیا کہ (نعوذ باللہ) حضورؐ کا دعویٰ رسالت جھوٹا تھا، کذب و افترا پر مبنی تھا، اور قرآن آپؐ کی تصنیف کردہ کتاب ہے، وہ بھی عیسائیوں اور یہودیوں سے مانگ تانگ کر اور مددلے کر، اور اپنے مضامین و اسلوب اور بے ربطی و بے ڈھنگے پن کی وجہ سے ہرگز کلام الٰہی کہلانے کی مستحق نہیں۔ یہ کوئی سنجیدہ، علمی مہم بھی نہ تھی۔ دور ظلمت (dark ages) ہو یا قرون وسطی (medieval)، یا زمانہ روشن خیالی (enlightenment) ___ اس مقصد کے لیے حضورؐ کے کردار پر انتہائی رکیک اور غلیظ الزامات گھڑے اور لگائے گئے، آپؐ کی زندگی کے ہر واقعے کو بدترین معنی پہنائے گئے اور اسے مسخ کیا گیا، قرآن کو ایک "خودساختہ اور ناقابل اعتبار" کتاب قرار دیا گیا، اور یہ الزام لگایا گیا کہ تلوار، خون ریزی اور قتل و غارت کے ذریعے، اور لوٹ مار اور جنسی و دنیاوی لذائذ سے لطف اندوزی کی کھلی چھوٹ کا لالچ دے کر، آپؐ

نے اپنے گرد پیروکار جمع کیے' اور ان کے ذریعے دنیا کو فتح کیا۔ یہ سب کچھ کہنے اور لکھنے کے لیے زبان بھی انتہائی غلیظ استعمال کی گئی۔ اتنی غلیظ کہ اس کا نقل کرنا بھی ممکن نہیں۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے' یا آگے نقل کریں گے' وہ دل پر انتہائی جبر کر کے' اس لیے کہ نقل کفر کفر نہ باشد' اور خود قرآن نے بھی مخالفین کے الزامات نقل کیے ہیں۔

سینٹ جان آف دمشق (م: ۷۵۳) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے قبل اموی دربار میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور اسلام سے ناواقف نہیں ہو سکتا تھا' وہ لکھتا ہے: "بنی اسماعیل کے درمیان محمد کے نام سے جھوٹے نبی نمودار ہوئے۔ وہ تورات و انجیل سے واقف تھے۔ ایک عیسائی راہب سے بھی تعلیم حاصل کی۔ ان کچی پکی معلومات کے بل پر انھوں نے عیسائیت کی ایک تحریف کردہ شکل وضع کر کے پیش کر دی۔ دھوکہ دے کر' لوگوں سے تسلیم کرا لیا کہ وہ خدا ترس انسان ہیں۔ پھر یہ افواہ پھیلا دی کہ ان پر آسمان سے کتاب مقدس نازل ہو رہی ہے۔ اس کتاب میں مضحکہ خیز مواد جمع کر کے' انھوں نے اپنے پیروکاروں کے سپرد کر دیا کہ اس کی پیروی کریں۔ عیسیٰ اور موسیٰ کی طرح' وہ اپنی وحی کی صداقت پر کوئی گواہ پیش نہ کر سکے' نہ کوئی معجزہ۔ ایسے شخص کی بات پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے جس نے زید کی بیوی زینب سے شادی کرنے کے لیے اپنی پسند کے مطابق وحی گھڑ لی!" (Encounters and Clashes: Islam and Christianity in History II, Rome) انھی خطوط پر' خلیفہ مامون (۸۱۳ تا ۸۳۳) کے ایک درباری نے عبدالمسیح الکندی کا قلمی نام اختیار کر کے الرسالہ کے نام سے ایک فرضی مکالمہ لکھا' اور حضورؐ کے بارے میں ہرزہ سرائی کرتے ہوئے کہا: محمد کس طرح سچے نبی ہو سکتے ہیں' جب کہ آپ نے خون ریزی کی' قافلے لوٹے' اخلاقی گراوٹ کا مظاہرہ کیا' اپنی نبوت کی تائید میں کوئی معجزات پیش نہ کیے۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے تو وہ سارا یہودیوں اور عیسائیوں سے سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہے' کتاب الٰہی کس طرح ہو سکتا ہے۔

سینٹ جان اور الکندی کے الرسالہ نے' اس صدی کے آغاز تک' حضورؐ کے بارے میں اہل یورپ کے رویے اور فکر کی تشکیل میں فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ ۱۲ویں صدی میں الرسالہ کا لاطینی ترجمہ اسپین میں شائع ہوا' ۱۵ویں صدی میں سوئٹزرلینڈ میں' یہاں تک کہ ۱۹ویں صدی میں سر ولیم میور نے انگریزی ترجمہ لندن سے شائع کرنا ضروری سمجھا۔ ایک ہزار سال کے اس طویل عرصے میں پادریوں اور یورپین دانش وروں نے رسالت محمدیؐ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے' وہ الکندی اور جان ہی کو دہراتے رہے ہیں۔ ۱۔ قرآن' یہودیوں اور عیسائیوں سے سیکھ کر وضع کیا گیا' متضاد اور الجھی ہوئی باتوں کا مجموعہ ہے' ۲۔ اخلاقی الزامات' ۳۔ سیاست دانوں اور حکمرانوں کی طرح موقع پرستی اور مکر و فریب کی کارروائیاں (اعاذنا اللہ من ذالک، ونشھد ان محمد اعبدہ و رسولہ)۔

ہم نے ان چیزوں کو نقل کرنا اس لیے ضروری سمجھا تاکہ یہ بتائیں کہ آج بیسویں صدی اپنے اختتام پر ہے، ایک طویل زمانہ گزر چکا ہے، اب اسلام اور مسلمانوں سے روز کا ربط ہے، سائنٹی فک انداز فکر، علمیت اور غیر جانب داری کے دعوے بھی ہیں، بلکہ ہمدردانہ اور منصفانہ معاملے کے بھی، لیکن اہل یورپ کی روش اور سوچ میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کی سوچ اور روش میں بھی جو ڈائیلاگ، فیاضی اور مراعات کی روش کے دعوے دار ہیں، مثلاً وینیکن منٹگمری واٹ، کینتھ کریگ وغیرہ۔ تال اور سر بدلے ہیں، راگ وہی ہیں، الفاظ مہذب ہو گئے ہیں، الزامات وہی ہیں، دشنام طرازی بھی وہی ہے، مگر تہذیب کے جامے میں ہے، زبان اور تعبیرات وہ ہیں جو آج کے زمانے میں قابل قبول ہوں مگر تہ میں بات وہی ہے۔ چنانچہ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہیں۔

رسول اکرمؐ اور قرآن کے متعلق قرون وسطیٰ میں غیر مسلموں کی طرف سے یہ باتیں کی جاتی تھیں کہ: "قرآن ایک بیل کے سینگوں پر رکھ کر لائے، فاختہ کے آکر کان میں وحی ڈال جانے کا ڈھونگ رچایا، مرگی کے دورے پڑتے تھے، جادوگر تھے اور لوگوں پر جادو کر دیا تھا، جنوں اور شیطانوں نے قابو پا لیا تھا، کوئی مرتد عیسائی پادری تھا جو مسلسل سکھاتا پڑھاتا تھا۔ لیکن اب ان توجیہات کی جگہ ایسے نفسیاتی، سماجی، معاشی اور سیاسی عوامل نے لے لی ہے جن سے جدید ذہن زیادہ آشنا ہے۔ مثلاً، راڈنسن (Rodinson)، فرائڈ کی راہ نمائی میں، حضورؐ کی نفسیاتی تحلیل کرتا ہے اور قرآن و رسالت کا سراغ پیش کرتا ہے۔ واٹ (Watt)، سوشیالوجی کے اوزار سے لیس، اس سرچشمے کا سراغ عرب کی ریگستانی اور بدویانہ زندگی میں، جاہلیت کی خرابیوں میں، مکہ میں حنیفوں کے اثرات میں، عیسائی اور یہودی تعلیمات و اثرات میں، اور اہل عرب کی سیاسی ضرورت میں پاتا ہے۔ کریگ (Cragg) سوال اٹھاتا ہے کہ "رسولیت نے کہاں جنم لیا؟" اور جواب دیتا ہے کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اس جستجو اور آرزو میں کہ عرب متحد ہوں، اور اس یقین میں، کہ ایک کتاب الٰہی ہی، ایک عربی قرآن ہی، ان کو اتحاد و تشخص دے سکتا ہے"۔ یہ ایقان کیوں کر پیدا ہوا: "عیسائیوں اور یہودیوں کو دیکھ کر، کہ وہ بھی اہل کتاب تھے"۔ بس قرآن ابلنا شروع ہو گیا۔

پھر کوئی بھی "ہمدردانہ" تحریر ایسی نہیں جو (نعوذباللہ) وحی الٰہی میں خارجی مداخلت ثابت کرنے کے لیے شیطانی آیات کے واقعے، سیاسی موقع پرستی اور دنیاداری کے ثبوت کے لیے نخلہ کے واقعے، خون آشامی کی شہادت کے طور پر بنو قریظہ کے قتل کے واقعے، اور اخلاقی گراوٹ ظاہر کرنے کے لیے حضرت زینب کے ساتھ نکاح کے واقعے سے خالی ہو۔

جو لوگ حضورؐ کے مخاطب تھے اور رسالت کے منکر، جو آپؐ کے خلاف ہجو کہتے پھرتے تھے، وہ

بھی اتنے اخلاق سے عاری نہ تھے کہ حضورؐ پر کوئی اخلاقی الزامات لگائیں۔ لیکن اس کے علاوہ، جاہلیت عرب کا انکار رسالت، جاہلیت جدیدہ کے انکار رسالت سے کچھ بھی مختلف نہ تھا۔ وہی الزامات، وہی اعتراضات: شاعر ہیں، کاہن ہیں، پاگل ہیں، جن آگئے ہیں، جادوگر ہیں اور جادو کر دیتے ہیں، خود کلام گھڑتے ہیں اور اسے اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں "ایک جھوٹ ہے جو انھوں نے گھڑ لیا ہے، اور اس میں دوسرے لوگوں نے ان کی مدد کی ہے"۔ "یہ گزرے ہوئے لوگوں کے قصے ہیں جن کو انھوں نے لکھ لیا ہے، اور یہ ان کو صبح و شام لکھوائے جاتے ہیں" (الفرقان: ۴-۵)۔ "کہتے ہیں کہ ان کو تو یہ سب کچھ ایک آدمی سکھاتا ہے، لیکن یہ جس کی طرف اشارا کرتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور یہ عربی مبین ہے" (النحل: ۱۰۳)۔

یورپ کی ہزار سالہ مخالفت کو دیکھو تو بے اختیار نگاہوں کے سامنے یہ تصویر آن کھڑی ہوتی ہے: "كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ، اَتَوَاصَوْا بِهٖ، بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ" "اسی طرح ان سے پہلے جن لوگوں کے پاس رسولؐ آیا، اس کو یہی کہا کہ جادوگر ہے، یا مجنون، ایسا لگتا ہے گویا ایک دوسرے کو یہی وصیت کر مرے ہیں (کہ یہ کہنا) کوئی نہیں دراصل ان سب نے سرکشی پر کمر باندھ لی ہے" (الذاریات: ۵۲-۵۳)۔

اس بات کو نارمن ڈینیل (Daniel) اپنی کتاب Islam and the West, the making of an image میں یوں لکھتا ہے: "ہم انتہائی غیر جانبدار اسکالر کی تحریر بھی پڑھیں، تو ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ قدیم عیسائیت نے [اسلام اور محمدؐ] کے بارے میں کیا انداز فکر و گفتگو اختیار کیا تھا۔ اس لیے کہ وہ انداز ہمیشہ ہر اس مغربی ذہن کا لازمی جزو رہا ہے، اور آج بھی ہے، جو اس موضوع پر سوچتا اور بات کرتا ہے (ص ۲۰۱)۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی کتاب و رسالت کے خلاف عیسائیت اور اہل مغرب کی اس شدید دشمنی کے اسباب کیا ہیں؟

چند تاریخی، سیاسی اور نفسیاتی اسباب کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ ان کی نظر میں، ان پر اسلام کی صورت میں جو تباہ کن آفت نازل ہوئی تھی، اس کی حیرت انگیز قوت و شوکت اور غلبے کا راز رسالت محمدیؐ پر ایمان اور حضورؐ کی ذات سے محبت و وابستگی میں مضمر تھا۔ اس کے مقابلے کا راستہ اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ قوت اور زندگی کے اس منبع کو ختم کیا جائے۔ اس کو ختم کرنے کا طریقہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ حضورؐ کو نعوذباللہ جھوٹا نبی، قرآن کو آپؐ کی تصنیف، اور آپؐ کے کردار کو انتہائی پست ثابت کیا جائے، خواہ اس کے لیے جھوٹ گھڑنا پڑے اور تہذیب و معقولیت کی ہر حد

پھلانگنا پڑے۔

آج یہ بات کھلم کھلا تو نہیں کہی جا رہی' لیکن اس کا واضح اعتراف موجود ہے۔ لندن کا ہفت روزہ اکنامسٹ لکھتا ہے کہ "دنیا کی قیادت کے لیے مغربی تہذیب کا حریف ایک ہی ہو سکتا ہے: وہ ہے اسلام۔ اس سے مغرب کا تصادم ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ اسلام ایک آئیڈیا ہے' آج کی دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد آئیڈیا۔ یہ آئیڈیا انسانی تجربے اور مشاہدے سے ماوراحق کے وجود پر یقین کا مدعی ہے! اس کے نزدیک یہ حق وہ ہے جو ۱۴۰۰ سال پہلے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوا' اور قرآن کی صورت میں محفوظ و موجود ہے۔ ایک تہذیب کی قوت اور غلبے کے لیے ایسے الحق پر یقین کی قوت کے برابر کوئی قوت نہیں۔ اسی لیے یوروپین' اسلام اور مسلمانوں سے خائف ہیں۔ انھیں خطرہ ہے کہ ایک نئی سرد جنگ آ رہی ہے' جو غالباً "سرد" نہ رہے گی"۔

اسی لیے آج بھی رسالت محمدیؐ حملوں کا سب سے بڑا ہدف ہے۔ جہاں موقع ملے' ذات گرامیؐ پر بھی گندگی ڈالنے سے اجتناب نہیں' لیکن یہ کام بالعموم سلمان رشدیوں اور تسلیمہ نسرینوں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ اپنا اسلوب بدل دیا گیا ہے۔ اب کچھ لوگ حضورؐ کو پیغمبر تسلیم کرنے کے دعوے دار ہیں لیکن تورات کے اسرائیلی انبیا کی طرح کا پیغمبر' (جن کی تاریخ خود انھوں نے داغ دار کی ہے)۔ کچھ لوگ وحی کی حقیقت و نوعیت ہی کو مکالمہ اور مفاہمت کے نام پر بدلنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ کچھ سینٹ پال کی طرح کے مصلح کے ورود کے متمنی ہیں جو "شریعت" سے نجات دے۔ کچھ چاہتے ہیں کہ قرآن کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے: ایک' عقائد و اخلاق کی تعلیم' اس کو کلام الٰہی مان لیا جائے۔ دوسرا' زندگی بسر کرنے کے ضوابط' ان کو حضورؐ کی تصنیف قرار دیا جائے جو قابل تغیر و تبدل ہے۔ کچھ کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے' لیکن وہ انسانی حقوق' عورت کے مقام اور جمہوریت کے قیام کے نام پر وہ چیزیں دل و دماغ میں اتار رہے ہیں' اور امت محمدیؐ کی زندگی اور عمل کو ایسے سانچے میں ڈھال رہے ہیں جو رسالت پر ایمان اور ناقابل تغیر و تبدل حق پر یقین کو خود بخود بے معنی اور غیر موثر کر کے رکھ دے گا۔

اکنامسٹ نے بالکل صحیح کہا ہے' کہ آج رسالت محمدیؐ پر یقین و ایمان ہی مغربی تہذیب کے لیے واحد حریف اور سب سے بڑا خطرہ ہے' اور مسلمانوں کے لیے بے پناہ قوت کا سرچشمہ۔ آئیے مختصراً دیکھیں کہ کس طرح؟

۱۔ مغربی تہذیب اور جدیدیت (modernism) کی بنیاد یہ ہے کہ انسان اب بالغ ہو چکا ہے' کسی ماورائے انسان وجود یا ذریعے سے علم اور راہ نمائی لینے کا محتاج نہیں۔ وہ مستغنی ہے' خصوصاً خدا اور وحی جیسے ان ذرائع و تصورات سے جن کو اس نے اپنے عہد طفولیت میں اپنے سہارے اور تسلی کے

لیے گھڑ لیا تھا۔ رسالت محمدیؐ اس کے برعکس، یہ علم اور یقین بخشتی ہے کہ خالق کا وجود حقیقی ہے۔ وہ علوم کا رشتہ بھی اس کے نام سے جوڑتی ہے، زندگی کا بھی۔ وہی خالق حقیقی کھاتا بھی کھلاتا ہے، شفا بھی بخشتا ہے، اختیار و قدرت بھی صرف اس کو حاصل ہے، زندگی بسر کرنے کا صحیح راستہ بھی وہی دکھاتا ہے۔ انسان ہر لحاظ سے اس کا محتاج، فقیر اور غلام و بندہ ہے۔

۲۔ مغربی تہذیب کے فلسفہ علم (epistemology) کی بنیاد یہ ہے کہ علم کا ذریعہ صرف انسانی حواس اور عقل ہیں، تجربہ و مشاہدہ ہے، سائنٹیفک میتھڈ ہے۔ یہ سارا علم بھی ظنی ہے۔ جو آج صحیح ہے وہ کل غلط ہو سکتا ہے، بلکہ غلط ثابت ہونے کا امکان نہ ہو تو وہ علم ہے ہی نہیں۔ ایک عقیدہ ہے۔ قطعی اور یقینی علم کے نام کی کوئی چیز دنیا میں پائی ہی نہیں جاتی، جو معیار حق ہو، جس کے آگے لوگ سر تسلیم خم کریں، جس کے لیے کوئی کسی سے مطالبہ کر سکے کہ اس کو مانو اور اس پر چلو۔ اس کے برعکس، رسالت محمدیؐ اس شعور سے معمور کرتی ہے کہ علم یقینی کا وجود ہے اور اس کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے، حضورؐ کی رسالت ہے۔ زبردستی کسی پر نہیں کی جا سکتی، لیکن جو مان لیں انھیں اس علم کے آگے سر تسلیم خم کرنا چاہیے، جہاں اختیار ہو وہاں اس علم کے مطابق چلنا اور چلانا چاہیے۔ مغرب نے حق اور باطل کے الفاظ کو متروک بنا دیا ہے، اور ان کا استعمال تہذیب و فیشن کے خلاف۔ رسالت محمدیؐ کے ماننے والوں کے لیے یہ الفاظ آج بھی سچائی اور زندگی سے بھرپور ہیں، اور ہمیشہ رہیں گے۔

۳۔ مغرب کے نزدیک اخلاق و اقدار ہوں یا قوانین و ضوابط، ہر چیز اچھی ہے یا بری، مفید ہے یا مضر، جیسا اپنا اپنا احساس ہو، نقطہ نظر ہو، پسند و ناپسند ہو۔ حقیقت کا انحصار دیکھنے والے کی پوزیشن پر ہے۔ چنانچہ ہر چیز اضافی (relative) طور پر صحیح یا غلط ہوتی ہے، کوئی چیز فی نفسہ حق اور باطل نہیں ہو سکتی۔ رسالت محمدیؐ کے ماننے والوں کے نزدیک ان چیزوں کی جو حقیقت وحی نے طے کر دی ہے اسے کسی کی رائے، پسند و ناپسند یا تجربہ و دلیل سے بدلا نہیں جا سکتا۔ لَامُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ

۴۔ مغربی تہذیب کے نزدیک علوم غیبی۔۔۔ اللہ، فرشتے، وحی، زندگی بعد موت کے نام کی کوئی چیز کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس رسالت محمدیؐ کے ماننے والوں کے نزدیک زندگی کے معنی و مقصد اور انسان کی حقیقت کا علم صرف علوم غیبی ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ حقائق جن کی تعلیم رسالت محمدیؐ نے دی ہے جیتے جاگتے حقائق ہیں۔ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ۔

۵۔ دنیا اور دنیا کی زندگی سے رسالت محمدیؐ کے ماننے والوں کو اتنی ہی گہری اور بھرپور دلچسپی ہے جتنی اہل مغرب کو۔ لیکن مغرب کی دلچسپی کا ہدف یہیں دنیا میں انسان کی خوشی، راحت، لذت اور زندگی کی کیفیت و معیار ہے، کہ وہی مقصود ہیں۔ اس کے برعکس، رسالت محمدیؐ کے ماننے والوں کی

دلچسپی دنیا میں اہل دنیا کی بھلائی اور آخرت میں اپنی بھلائی کے لیے ہے۔اس کے نتیجے میں دو بالکل مختلف قسم کی شخصیتیں اور معاشرے وجود میں آتے ہیں۔لَا یَسْتَوِیْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ

آج کی تہذیبی جنگ میں رسالت محمدیؐ کے مسئلے کو جو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے' اس کا پورا ادراک ان سب کو ہونا چاہیے جو دین سے محبت رکھتے ہیں' جو غلبہ دین کی تمنا رکھتے ہیں یا اس کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔اس ادراک کی روشنی میں انھیں اپنی ترجیحات پر بھی نظر ڈالنا چاہیے' اور حکمت عملی پر بھی۔

پہلی بات یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ہمارا یہ زمانہ اگرچہ عہد نبویؐ سے چودہ صدیوں کے فاصلے پر واقع ہے' اور ہم جن تمدنی حالات میں اسلامی زندگی اور اس کے غلبے کے لیے کوشاں ہیں' وہ اس عہد سے بہت مختلف ہیں' لیکن یہ ہے اسی عہد نبویؐ کا حصہ اور تسلسل۔کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی قوم کی طرف نہیں ساری انسانیت کی طرف مبعوث فرمائے گئے ہیں' اور آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے' اس لیے آپؐ ہماری اکیسویں صدی کے لیے اسی طرح رسول ہیں جس طرح چھٹی صدی کے لیے تھے' اور آج کے سارے انسان اسی طرح آپؐ کی ''قوم'' ہیں اور آپؐ کے مخاطب' جس طرح اس وقت کے اہل عرب اور ساری دنیا والے تھے۔اس سیدھی سادی بات کے دور رس مضمرات ہیں۔چنانچہ آج کے زمانے اور لوگوں تک آپؐ کی رسالت کی دعوت اس طرح پہنچانا ان کا حق ہے جس طرح آپ نے پہنچائی۔

دوسری بات یہ سمجھنا ضروری ہے کہ بہ حیثیت رسول اللہؐ آپ ہمارے درمیان موجود ہیں۔کیونکہ آپؐ کی لائی ہوئی کتاب موجود ہے' آپؐ کی سیرت اور اسوہ موجود ہے' آپؐ کا دین موجود ہے' اور ان امانتوں کی حامل' آپؐ کی امت موجود ہے۔گویا اپنی رسالت کی طرف دعوت دینے کا جو مشن بہ حیثیت رسول آپؐ نے ادا کیا اب اسے ادا کرنے کے لیے امت ذمہ دار ہے۔

تیسری بات یہ سمجھنا ضروری ہے کہ رسول کی موجودگی میں جو دعوت اور اسلام و جاہلیت کے درمیان جو تہذیبی کشمکش برپا ہوتی ہے' اس میں رسالت کی طرف دعوت کو اولین اور فیصلہ کن مقام حاصل ہوتا ہے۔درجے کے لحاظ سے' ایمان باللہ کو اسلامی زندگی کا مرکز اور روح ہے' سب سے اعلیٰ مقام حاصل ہے' رسالت کا مدعا وہی ہے۔لیکن ترتیب کے لحاظ سے ایمان بالرسالت کی حیثیت اولین اور فیصلہ کن ہے۔آدمی رسول کو اللہ کا رسولؐ مانتا ہے' تب ہی وہ اللہ اور ہر دوسری چیز تک پہنچتا ہے۔ایمان باللہ وہی حق اور معتبر ہے جس کی تعلیم حضورؐ نے دی' اور اس لیے ہے کہ آپؐ اللہ کے سچے رسول ہیں۔قرآن اسی لیے بلاشک و شبہہ کلام الٰہی ہے کہ رسالتِ محمدیؐ ہر شک و شبہ سے

بالاتر ہے۔ حلال و حرام، واجبات و منہیات اور عذاب و ثواب کے لیے کوئی عقلی یا تجربی دلیل، سند ناطق نہیں سوائے حکم نبویؐ کے۔ پھر عمل کے لحاظ سے تو ایمان و اتباعِ رسالت، عین اطاعتِ الٰہی اور قربِ الٰہی کے مترادف ہے۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ اور قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اسی مقام رسالت کی شہادت ہیں۔

چوتھی بات یہ سمجھنا ضروری ہے کہ آج کی ضرورت یہ ہے کہ دعوت و جہاد میں رسالت کی طرف دعوت کو یہی مقام حاصل ہو۔ اس کے بغیر اللہ کا اقرار بھی کوئی معنی نہیں رکھتا، کجا کہ جمہوریت اور انسانی حقوق جیسی سماجی اقدار پر اتفاق و اقرار۔ ورنہ یہودی توحیدِ الٰہی کا عقیدہ رکھتے تھے، عیسائیوں کو موحد ہونے کا دعویٰ تھا، اور ان کی عبادات و اخلاقی فضائل کی تعریف خود قرآن نے فرمائی ہے۔ مگر وہ مغضوب اور ضال ٹھہرے، کہ ایمان بالرسالت سے انکاری تھے۔

پانچویں بات یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایمان بالرسالت اس معنی میں بھی فیصلہ کن ہے کہ اللہ کی طرف سے نصرت، نجات اور غلبے کا وعدہ، رسولوں سے اور ان لوگوں سے ہے جو رسول معبوث پر حقیقی معنوں میں ایمان لائیں، تن من دھن سے اس کے پیچھے چلیں، اور اس کے اعوان و انصار بنیں، وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ - اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ - وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (الصافات ۳۷: ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳)

چھٹی بات یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ازل سے جو معرکہ چراغِ مصطفویؐ اور شرارِ بولہبی کے درمیان برپا ہے، اور جو آج اسلام اور مغرب کے درمیان تہذیبی جنگ کی صورت اختیار کر رہا ہے، وہ دراصل انسانوں کے دل اور زندگیاں جیتنے کا معرکہ ہے۔ دل فتح ہوں گے تو غلبہ دین حاصل ہو گا۔ قوت سے زمین فتح ہو سکتی ہے، اموال فتح ہو سکتے ہیں، سیاسی اقتدار پر قبضہ ہو سکتا ہے، زندگیاں فتح نہیں ہو سکتیں، دلوں پر قبضہ نہیں ہو سکتا۔ دلیل سے موافقت اور حمایت حاصل ہو سکتی ہے، یکسوئی، لگن اور جاں بازی اور سرفروشی نہیں۔ دل جیتنے کا راستہ صرف ایک ہے۔ لوگ رسالتِ محمدیؐ کی صداقت پر ایمان لے آئیں، آپؐ کے ہاتھ میں اپنے ہاتھ دے دیں، اپنے دل آپؐ کی محبت سے بھر لیں، آپؐ کے آستانے پر سر رکھ دیں، آپؐ کی اطاعت و محبت اور آپ پر اعتماد و یقین سے سرشار ہو کر آپ کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔ پہلے بھی لوگ اور دل اسی طرح فتح ہوئے تھے، تہذیبی جنگ اسی طرح جیتی گئی تھی، آج بھی اسی طرح فتح ہوں گے، اور اسی طرح جنگ جیتی جا سکے گی۔

اس بات کو سمجھنا بڑا اہم ہے۔ یقیناً ہمیں اسلام کی حقانیت اور برتری ثابت کرنا چاہیے، ہمیں بتانا چاہیے کہ سودی معیشت انسان کے لیے کتنی تباہ کن ہے، اسلام کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی و خاندانی نظام میں کیا محاسن ہیں، اسلام کی خوبیاں کیا ہیں۔ لیکن ہمیں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ان سب

کاموں کی حیثیت زمین کو نرم و ہموار اور فضا کو سازگار بنانے کی ہے۔ لوگ یہ سب کچھ مان بھی لیں، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ایمان نہ لائیں تو تہذیبی جنگ میں کامیابی کی راہ ہموار نہ ہوگی۔ کتنے لوگ ہیں جو اسلام کی تعریفیں کرتے ہیں، اس کے آرٹ اور فن تعمیر کی داد دیتے ہیں، اس کی روحانیت اور تصوف کے ثناخواں ہیں، لیکن وہ محمد رسول اللہؐ کو اللہ کا رسول مان کر آپؐ کا اتباع کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے وہ رسالت کے مشن کے اعوان و انصار نہیں بن سکتے۔

اسی طرح اگر ہم یہ ثابت بھی کر دیں اور ہمیں یہ ثابت ضرور کرنا چاہیے لیکن اس مشق کے محدود نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے۔ کہ اسلام میں بھی جمہوریت ہے، اسلام دوسروں سے بڑھ کر حقوق انسانی کی ضمانت دیتا ہے، اسلام نے عورتوں کو وہ مقام دیا ہے جو آج تک مغرب نے بھی نہیں دیا ہے، اسلامی حدود ظالمانہ نہیں بلکہ منصفانہ اور زیادہ رحم دلانہ ہیں، تو اس سے بھی دلوں کے جیتنے کے امکانات روشن نہ ہوں گے۔ اس کے لیے عقلی اتفاق سے زیادہ رسولؐ پر اعتماد و محبت درکار ہے۔

چنانچہ ہمارے کرنے کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ ہم دعوت الی الرسالت کو اپنے ایجنڈے پر سرفہرست مقام دیں۔ ہمارا مطلب یہ نہیں کہ ہم بے ڈھنگے طریقے سے، جا و بے جا، یہ کہنا اور لکھنا شروع کر دیں کہ حضورؐ سچے رسول تھے، حضورؐ پر ایمان لاؤ، یا کفر کے فتوے جاری کرنے شروع کر دیں۔ نہیں، بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ:

اول: ہم ہر ممکن طریقے سے، تحریر و تقریر سے، جدید ذرائع ابلاغ سے، لوگوں کو آپؐ کی شخصیت کے بے مثال حسن، آپؐ کے خلق عظیم کے بے نظیر جمال، آپؐ کی رحمت و رافت و شفقت اور انسانیت کے عدیم المثال کردار سے آگاہ کریں، بار بار کریں، بہ کثرت کریں، نئے نئے اسلوب سے کریں، خصوصاً ان کے سامنے کریں، اور ان کی زبانوں میں کریں، جو آج، آپؐ کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ دو بہت اگر آپؐ سے چمٹ کر رہ گئے تو آپؐ کی نرمی اور محبت کی وجہ سے، دشمن آ کر اگر آپؐ کے غلام بے دام بن گئے تو آپؐ کے اخلاق حسنہ کی وجہ سے۔

دوم: ہم وہ بھی جو داعیان حق ہیں، اور وہ بھی جو عام مسلمان ہیں اپنے برتاؤ، سلوک، اور گفتگو کو جتنا حضورؐ کے اخلاق و کردار کا نمونہ بنا سکیں، بنائیں۔ حضورؐ کو دیکھنے کے لیے صرف کتابیں، تقریریں اور وڈیو نہ ہوں، بلکہ ہماری زندگی میں بھی لوگوں کو کوئی نہ کوئی کرن اور جھلک آپؐ کی نظر آ سکے۔ ہمارے گھر، ہماری پبلک سرگرمیاں، ہماری مساجد، حضورؐ کی زندگی اور پیغام کا نور پھیلائیں، مسجدیں نہ ماننے والوں کا اسی طرح استقبال کریں جس طرح حضورؐ نے نجران اور ثقیف کے وفود کا فرمایا۔ یہ اسی وقت ممکن ہے، جب ہماری حالت، کسی بھی درجے میں، اقبال کے اس شعر کی مصداق بن جائے:

نوائے او بہ ہر دل سازگار است کہ در ہر سینہ قاشے از دلِ اوست

ترجمہ: اس کی آواز ہر دل کے لیے سازگار ہے۔ ہر سینے میں اس کے دل کا ایک ٹکڑا ہے۔

سوم: پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ہم حضورؐ کو پیش کرنے کا ایسا اسلوب وضع کریں کہ، بغیر مناظرہ بازی کے، دشمنوں نے آپ کے خلاف جو کچھ کہا ہے، اس کا ازالہ ہو جائے۔ بات کرنے والا اچھی طرح جانتا ہو کہ فساد کی جڑ کیا ہے، اور کسی بحث و نزاع کے بغیر وہ حضورؐ کو اس طرح متعارف کرائے کہ اس فساد کی جڑ خود بخود کٹ جائے۔

چہارم: حضورؐ کے دین اور پیغام کو عمل کا جامہ پہنانے کی جدوجہد تو بہرحال اصل کام ہے۔

امام مسلم، حضرت ابوہرہؓ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے، اس امت میں سے جو میرے بارے میں "سنے" یہودی ہو یا عیسائی، پھر وہ جو میں لایا ہوں اس پر ایمان لائے بغیر مرجائے، وہ آگ میں جائے گا"۔ نووی کہتے ہیں کہ اس امت سے مراد "امت دعوت" ہے، یعنی آپؐ کی رسالت سے لے کر قیامت تک تمام اہل زمین۔ لیکن امام غزالی بڑی اہم بحث اٹھاتے ہیں: "سننے" کا کیا مطلب ہے؟ کیا صرف کانوں سے نام سن لینا؟ نہیں، وہ کہتے ہیں، اس سے حضورؐ کی زندگی اور پیغام کے بارے میں اس طرح سننا مراد ہے جو دل و دماغ کے ماننے کے لیے ضروری ہے۔ ورنہ جن پر "سنانے" کی ذمہ داری ہے، وہ زیادہ آگ کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ آج تو نہ ماننے والوں کی عظیم اکثریت نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہی نہیں سنا ہے، سنا ہے تو سرسری طور پر یا مخالفانہ۔ جن لوگوں کو کماحقہ سنایا گیا ہے، وہ برائے نام ہیں۔ پھر اربوں انسانوں کے "اپنے رسول"، آخری رسول پر ایمان نہ لانے کے لیے مسئول کون ہے؟ کیا ہم نہیں؟

جس طرح حضورؐ نے ایک ایک ملک میں اپنے ایلچی بھیجے تھے، آج ایک ارب مسلمان دنیا کے گوشے گوشے میں آپؐ کے ایلچی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں آپؐ کا خط ہے۔ جس کو بھی اپنی اس پوزیشن اور ذمہ داری کا احساس ہو، اسے تڑپ کر کھڑا ہو جانا چاہیے۔ سلیقے سے، حکمت سے، موعظۃ حسنہ سے، انسانوں کو حضورؐ سے قریب لانا چاہیے۔ جتنا زور ہم آپؐ کا دین پیش کرنے پر لگاتے ہیں، اتنا ہی اہتمام ہمیں آپؐ کی ذات، شخصیت، کردار، اسوۂ حسنہ اور زندگی کو پیش کرنے پر لگانا چاہیے۔ جو سراج منیر سے جتنا قریب آئے گا، اس کا دل کھلا ہو گا، وہ حضورؐ کی روشنی اور حرارت میں سے حصہ پائے گا۔ جتنے لوگ حضورؐ کی رسالت پر ایمان لاتے جائیں گے، آپؐ کے آستانے سے وابستہ ہوتے جائیں گے، اتنا ہی تہذیبی جنگ میں حضورؐ کے پیغام کی فتح کے امکانات بڑھتے جائیں گے۔

یہ ایک قرض ہے جو ہم سب پر ہے، اور ہم میں ہر ایک کو اسے ادا کرنے کے لیے اپنا حصہ ادا کرنے کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔

دنیا کی مشترک میراث

ہم مسلمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "سرورِ عالم" کہتے ہیں۔ سیدھی سادی زبان میں اس کا مطلب ہے "دنیا کا سردار"۔ بظاہر یہ بہت بڑا خطاب ہے، مگر جس بلند پایہ ہستی کو یہ خطاب دیا گیا ہے، اس کا کارنامہ واقعی ایسا ہے کہ اس کو سرورِ عالمؐ کہنا مبالغہ نہیں، عین حقیقت ہے۔

دیکھیے! کسی شخص کو دنیا کا لیڈر کہنے کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہونی چاہیے کہ اس نے کسی خاص قوم یا نسل یا طبقہ کی بھلائی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کی بھلائی کے لیے کام کیا ہو۔ دوسری اہم شرط جو دنیا کا لیڈر ہونے کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ایسے اصول پیش کیے ہوں جو ساری دنیا کے انسانوں کی رہ نمائی کرتے ہوں اور جن میں انسانی زندگی کے تمام اہم مسائل کا حل موجود ہو۔ تیسری لازمی شرط دنیا کا لیڈر ہونے کے لیے یہ ہے کہ اس کی رہ نمائی کسی خاص زمانے کے لیے نہ ہو، بلکہ ہر حال اور ہر زمانے میں یکساں مفید، یکساں صحیح اور یکساں قابلِ پیروی ہو..... چوتھی اہم ترین شرط یہ ہے کہ اس نے صرف اصول پیش کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا ہو بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کو زندگی میں عملاً جاری کر کے دکھایا ہو، اور ان کی بنیاد پر ایک جیتی جاگتی سوسائٹی پیدا کر دی ہو۔

آئیے اب ہم دیکھیں کہ یہ چاروں شرطیں اس ہستی میں کہاں تک پائی جاتی ہیں جس کو ہم "سرورِ عالمؐ" کہتے ہیں۔

پہلی شرط کو پہلے لیجیے۔ آپ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ایک ہی نظر میں محسوس کر لیں گے کہ یہ کسی قوم پرست یا محبِ وطن کی زندگی نہیں ہے بلکہ ایک محبِ انسانیت اور ایک عالم گیر نظریہ رکھنے والے انسان کی زندگی ہے۔ ان کی نگاہ میں تمام انسان یکساں تھے۔ کسی خاندان، کسی طبقے، کسی قوم، کسی نسل، یا کسی ملک کے خاص مفاد سے انھیں دلچسپی نہ تھی۔ امیر اور غریب، اونچ اور نیچ، کالے اور گورے، عرب اور غیر عرب، مشرقی اور مغربی، سامی اور آرین، سب کو وہ اس حیثیت سے دیکھتے تھے کہ یہ سب ایک ہی انسانی نسل کے افراد ہیں۔ ان کی زبان سے تمام عمر کوئی ایک لفظ یا ایک فقرہ بھی ایسا نہ نکلا، اور نہ زندگی بھر میں کوئی کام انھوں نے ایسا کیا جس سے یہ شبہ

کیا جا سکتا ہو کہ انھیں ایک طبقہ انسانی کے مفاد سے زیادہ تعلق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی ہی میں حبشی، ایرانی، رومی، مصری اور اسرائیلی، اسی طرح ان کے رفیق کار بنے جس طرح عرب۔ اور ان کے بعد زمین کے ہر گوشے میں ہر نسل اور ہر قوم کے انسانوں نے ان کو اسی طرح اپنا رہنما تسلیم کیا جس طرح خود ان کی اپنی قوم نے۔ یہ اسی خالص انسانیت ہی کا کرشمہ تو ہے کہ آج آپ [ہر سی]کی زبان سے اس شخص کی تعریف سن رہے ہیں جو صدیوں پہلے عرب میں پیدا ہوا تھا۔

اب دوسری اور تیسری شرط کو ایک ساتھ لیجیے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص قوموں اور مخصوص ملکوں کے وقتی اور مقامی مسائل سے بحث کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ اپنی پوری قوت دنیا میں انسانیت کے اس بڑے مسئلے کو حل کرنے میں صرف کر دی جس سے تمام انسانوں کے سارے چھوٹے چھوٹے مسائل خود حل ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑا مسئلہ کیا ہے؟ وہ صرف یہ ہے کہ: ”کائنات کا نظام فی الواقع جس اصول پر قائم ہے، انسان کی زندگی کا نظام بھی اسی کے مطابق ہو، کیوں کہ انسان اس کائنات کا ایک جز ہے اور جز کی حرکت کا کل کے خلاف ہونا ہی خرابی کا موجب ہے“۔ اگر آپ اس بات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کی آسان صورت یہ ہے کہ اپنی نگاہ کو ذرا کوشش کر کے زمان اور مکان کی قیود سے آزاد کر لیجیے اور پورے کرہ زمین پر اس طرح نظر ڈالیے کہ ابتدا سے آج تک اور آیندہ غیر محدود زمانہ تک بسنے والے تمام انسان بہ یک وقت آپ کے سامنے ہوں۔ پھر دیکھیے کہ انسان کی زندگی میں خرابی کی جتنی صورتیں پیدا ہوئی ہیں یا ہونی ممکن ہیں، ان سب کی جڑ کیا ہے، یا کیا ہو سکتی ہے۔ اس سوال پر آپ جتنا غور کریں، جتنی چھان بین اور تحقیق کریں گے، حاصل یہی نکلے گا کہ: ”انسان کی خدا سے بغاوت تمام خرابیوں کی جڑ ہے“۔

اس لیے کہ خدا سے باغی ہو کر انسان لازمی طور پر دو صورتوں میں سے کوئی ایک ہی صورت اختیار کرتا ہے۔ یا تو وہ اپنے آپ کو خود مختار اور غیر ذمہ دار سمجھ کر من مانی کارروائیاں کرنے لگتا ہے، اور یہ چیز اسے ظالم بنا دیتی ہے، یا پھر وہ خدا کے سوا دوسروں کے حکم کے آگے سر جھکانے لگتا ہے، اور اس سے دنیا میں فساد کی بے شمار صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں خراب نتائج کیوں نکلتے ہیں؟ اس کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ ایسا کرنا چونکہ حقیقت کے خلاف ہے اس لیے اس کا نتیجہ برا نکلتا ہے۔ یہ ساری کائنات فی الواقع خدا کی سلطنت ہے۔ زمین، سورج، چاند، ہوا، پانی، روشنی، سب خدا کی ملک ہیں اور انسان اس سلطنت میں پیدائشی بندے (born subject) کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پوری سلطنت جس نظام پر چل رہی ہے، اگر انسان اس کا ایک جز ہونے کے باوجود اس سے مختلف رویہ اختیار کرے تو لامحالہ اس کا ایسا رویہ تباہ کن نتائج ہی پیدا کرے گا۔ اس کا یہ سمجھنا کہ مجھ سے اوپر کوئی مقتدر اعلیٰ نہیں ہے جس کے سامنے میں جواب دہ ہوں، واقعہ کے خلاف

ہے۔ اس لیے جب وہ خود مختار بن کر غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر کام کرتا ہے اور اپنا قانون زندگی آپ تجویز کرتا ہے تو نتیجہ برا نکلتا ہے۔ اسی طرح اس کا خدا کے سوا کسی اور کو صاحب اختیار و اقتدار ماننا اور اس سے خوف یا لالچ رکھنا' اس کی آقائی کے آگے جھک جانا بھی حقیقت کے خلاف ہے' یوں کہ وہ یہ حیثیت نہیں رکھتا۔ لہٰذا اس کا نتیجہ بھی برا ہی نکلتا ہے۔ صحیح نتیجہ برآمد ہونے کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ زمین و آسمان میں جو حقیقی حکومت ہے' انسان اس کے سامنے سر جھکا دے' اپنی خودی و خودسری کو اس کے آگے تسلیم کر دے' اپنی اطاعت اور بندگی کو اس کے لیے خالص کر دے اور اپنی زندگی کا ضابطہ و قانون خود بنانے یا دوسروں سے لینے کے بجائے اس سے لے۔

یہ بنیادی اصلاح کی تجویز ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کے لیے پیش کی ہے۔ یہ مشرق اور مغرب کی قید سے آزاد ہے۔ روئے زمین میں جہاں جہاں انسان آباد ہیں' یہی ایک اصلاحی تجویز ان کی زندگی کی بگڑی ہوئی کل کو درست کر سکتی ہے۔ اور یہ ماضی و مستقبل کی قید سے بھی آزاد ہے۔ ڈیڑھ ہزار برس پہلے یہ جتنی صحیح اور کارگر تھی اتنی ہی آج ہے اور اتنی ہی دس ہزار برس بعد ہو گی۔

اب آخری شرط باقی رہ جاتی ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف خیالی نقشہ ہی پیش نہیں کیا بلکہ اس نقشہ پر ایک زندہ سوسائٹی پیدا کر کے دکھا دی۔ انھوں نے ۲۳ برس کی مختصر مدت میں لاکھوں انسانوں کو خدا کی حکومت کے آگے سر اطاعت جھکانے پر آمادہ کر لیا۔ ان سے خود پرستی بھی چھڑائی اور خدا کے سوا دوسروں کی بندگی بھی۔ پھر ان کو جمع کر کے خالص خدا کی بندگی پر ایک نیا نظام اخلاق' نیا نظام تمدن' نیا نظام معیشت اور نیا نظام حکومت بنایا' اور تمام دنیا کے سامنے اس بات کا عملی مظاہرہ کر کے دکھا دیا کہ جو اصول وہ پیش کر رہے ہیں' اس پر کیسی زندگی بنتی ہے اور دوسرے اصولوں کی زندگی کے مقابلہ میں وہ کتنی اچھی' کتنی پاکیزہ اور کتنی صالح ہے۔

یہ وہ کارنامہ ہے جس کی بنا پر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سرور عالم یا سارے جہان کا لیڈر کہتے ہیں۔ ان کا یہ کام کسی خاص قوم کے لیے نہ تھا' تمام انسانوں کے لیے تھا۔ یہ انسانیت کی مشترک میراث ہے جس پر کسی کا حق کسی دوسرے سے کم یا زیادہ نہیں ہے۔ جو چاہے اس میراث سے فائدہ اٹھائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کے خلاف کسی کو تعصب رکھنے کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

عملی توبہ

"گناہوں کی تلافی کے لیے زبان اور قلب کی توبہ کے ساتھ عملی توبہ بھی ہونی چاہیے، اور عملی توبہ کی ایک شکل یہ ہے کہ آدمی خدا کی راہ میں مال خیرات کرے۔ اس طرح وہ گندگی جو نفس میں پرورش پا رہی تھی اور جس کی بدولت آدمی سے گناہ کا صدور ہوا تھا دور ہو جاتی ہے اور خیر کی طرف پلٹنے کی استعداد بڑھتی ہے۔

گناہ کرنے کے بعد اس کا اعتراف کرنا ایسا ہے جیسے ایک آدمی جو گڑھے میں گر گیا تھا، اپنے گرنے کو خود محسوس کر لے۔ پھر اس کا اپنے گناہ پر شرمسار ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اس گڑھے کو اپنے لیے نہایت بری جائے قرار سمجھتا ہے اور اپنی اس حالت سے سخت تکلیف میں مبتلا ہے، پھر اس کا صدقہ و خیرات اور دوسری نیکیوں سے اس کی تلافی کی سعی کرنا گویا گڑھے سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا ہے۔"

(تفہیم القرآن۔ ۲۔ ص ۲۲۱)

(خیر خواہ)

میں نے قرآن کو کیسے پایا؟

سید قطب شہید

سید قطب شہید کے اصول تفسیر کے دو پہلو ہیں جو انھیں دوسرے جلیل القدر مفسرین کے درمیان ممتاز کرتے ہیں۔ ایک 'قرآن میں فن تصویر کشی کی توضیح و تشریح اور اس سے استشہاد۔ دوسرے 'قرآن میں اسلام کی حرکیت' غلبے اور جہاد کا مقام۔ پہلے کے بارے میں انھوں نے اپنی سوچ کو التصویر الفنی فی القرآن نامی کتاب میں تفصیل سے پیش کیا ہے 'جس کا ترجمہ قرآن کے فنی محاسن (مترجم غلام احمد حریری) کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اسی موضوع پر صرف قیامت کے مناظر کی قرآنی تصویر کشی کے بارے میں ان کی کتاب مشاهد القیامه فی القرآن بھی ایک اعلیٰ درجے کی کتاب ہے۔ اس کا ترجمہ قرآن میں مناظر قیامت کے نام سے چھپ چکا ہے۔ التصویر الفنی فی القرآن کا تعارفی حصہ ترجمان میں شائع کیا جا رہا ہے۔ آیندہ اشاعتوں میں دوسرے حصے پیش کیے جائیں گے۔ ترجمہ کرتے ہوئے غلام احمد حریری صاحب کا ترجمہ پیش نظر رہا ہے 'لیکن یہ نیا ترجمہ ہے۔ (ش-م)

ابھی میں چھوٹا بچہ ہی تھا کہ قرآن پڑھنے لگا 'مگر اس کے معانی و مطالب تک پہنچنا میرے لیے ممکن نہ تھا اور نہ ہی اس کے بلند مقاصد کو میں سمجھ سکتا تھا۔ تاہم میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا اور اپنے جی میں قرآن کی تلاوت سے عجب سی کیفیت محسوس کرتا تھا۔ میرا سیدھا سادہ اور چھوٹا سا دماغ قرآن میں آنے والے بعض خیالات کو مجسم صورت میں میرے سامنے پیش کرتا۔ یہ تصاویر گو سادہ اور بے نقش و رنگ ہوتیں مگر ان کی وجہ سے میں اپنے اندر عجیب ذوق و شوق اور لذت محسوس کرتا۔ طویل عرصہ یہ کیفیت جاری رہتی 'اور میں ان تصاویر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

ان سادہ تصویروں میں سے جو اس وقت میرے ذہن میں نقش ہوا کرتی تھیں 'ایک وہ تصویر ہے جو اس آیت کی تلاوت کرتے وقت میرے سامنے آموجود ہوتی:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ نِ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ نِ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ (الحج ۲۲:۱۱)

اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی بندگی کرتا ہے۔ اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا

اور جو کوئی مصیبت آگئی تو الٹا پھر گیا۔ اس کی دنیا بھی گئی' آخرت بھی۔

اس خیالی تصویر کو اگر میں کسی کے سامنے پیش کروں تو اسے ہنسنا نہیں چاہیے۔ یہ تصویر یوں نگاہ تصور کے سامنے اس لیے ابھرتی کہ میں ان دنوں ایک گاؤں میں رہتا تھا' اور گاؤں کے قریب ہی وادی کا ایک خاص ٹیلہ دیکھا کرتا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے تصور میں یہ بات آتی تھی کہ گویا ایک شخص ہے جو ایک جھکے ہوئے بلند مکان کے کنارے پر یا تنگ سے ٹیلے کی چوٹی پر کھڑا نماز پڑھ رہا ہے' لیکن وہ کھڑا ہونے پر قادر نہیں بلکہ یوں کانپ رہا ہے گویا کہ گرا ہی چاہتا ہے' اور میں اس کے سامنے کھڑا بڑے ذوق و شوق کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہا ہوں اور عجیب کیف و نشاط محسوس کرتا ہوں۔

اسی طرح جو تصاویر ان دنوں مجسم ہو کر میرے سامنے آتی تھیں' ان میں سے ایک وہ ہے جو اس آیت کو پڑھتے ہی میرے سامنے آجاتی:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ
(الاعراف ۷: ۱۷۵'۱۷۶)

اور اے نبیؐ ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا' آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے اسے ان آیتوں کے ذریعے بلندی عطا کرتے' مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا۔ لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی۔ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے' اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔

میں اس آیت کے معنی و مطلب کو تو نہ سمجھتا تھا' مگر اس کے پڑھتے ہی ایک تصویر میری آنکھوں کے سامنے آموجود ہوتی۔ میں دیکھتا کہ ایک شخص منہ کھولے' زبان لٹکائے میرے سامنے کھڑا ہے اور ہانپتا جا رہا ہے۔ میں اس کے سامنے کھڑا ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہتا۔ لیکن میں یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میں اس کے قریب جانے کی جرات بھی نہ کر سکتا تھا۔

اس طرح کی مختلف صورتیں میرے چھوٹے سے ذہن میں منقش ہوتی تھیں' اور میں ان میں غور و فکر کرتے ہوئے بہت لطف اندوز ہوتا۔ ان ہی کی وجہ سے مجھ میں ذوق تلاوت پیدا ہوا اور میں قرآن کریم کی تلاوت کے وقت اس کی وادیوں میں ایسی ہی تصاویر کو تلاش کرتا رہتا تھا۔

وہ ایام اپنی ان شیریں یادوں اور سادہ خیالات سمیت گزر گئے۔ اب زمانہ بدل گیا اور میں نے علمی اداروں میں تحصیل علم کا آغاز کیا' کتب تفسیر نظر سے گزریں' اور اساتذہ سے تفسیر قرآن کا درس لیا۔ لیکن افسوس بالائے افسوس' کہ وہ شیریں اور حسین و جمیل قرآن جس کی تلاوت میں بچپن میں کیا

کرتا تھا، مجھے کہیں نظر نہ آیا۔

واحسرتا! قرآن میں حسن و جمال کے وہ سب نشانات خواب و خیال ہوگئے، لذت و اشتیاق سے قرآن خالی ہوگیا۔ کیا یہ دو قرآن ہیں؟ ایک بچپن کا شیریں، سہل، ذوق انگیز اور شوق افزا قرآن، اور دوسرا عالمِ شباب کا مشکل، پیچیدہ اور بظاہر غیر مربوط! شاید یہ تاثرات مقلدانہ اندازِ تفسیر کا کرشمہ تھے۔

میرے اندر ایک نئے رجحان نے انگڑائی لی، اور میں نے کتبِ تفسیر سے نگاہ ہٹا کر قرآن کو خود اس کی مدد سے پڑھنا شروع کیا۔ حیرت کی بات ہے کہ مجھے پھر میرا کھویا ہوا حسین اور پیارا قرآن مل گیا۔ وہی شوق انگیز، لذیذ تصویریں میری نگاہ کے سامنے گھومنے لگیں۔ صرف اتنا فرق تھا کہ ان تصاویر میں وہ پہلی سی سادگی باقی نہ رہی تھی کیونکہ میرے سوچنے سمجھنے کے زاویے تبدیل ہو چکے تھے۔ اب میں ان تصاویر کے اغراض و مقاصد سمجھنے لگ گیا تھا، اور جانتا تھا کہ یہ تصویریں نہیں مثالیں ہیں جو فہم قرآن کے لیے بیان کی گئی ہیں، ان میں کسی حادثہ کی منظرکشی نہیں کی گئی۔ لیکن ان تصاویر کی سحر طرازی کا وہی عالم تھا، ان میں ہنوز وہی جاذبیت اور اثر آفرینی باقی تھی۔

الحمدللہ! میں نے قرآن کو پھر سے تلاش کر لیا۔

۱۹۳۹ میں، میں نے ایک مضمون "التصویر الفنی فی القرآن" کے نام سے شائع کیا۔ اس مضمون میں، میں نے بعض قرآنی تصاویر کا ذکر کر کے ان کے فنی حسن و جمال پر روشنی ڈالی۔ میں نے بتایا کہ ان آیات میں خداوند کریم نے صرف الفاظ کے ذریعے جو تصویر کھینچی ہے، رنگین موقلم اور کیمرے بھی اس سے عاجز ہیں۔

کئی سال بیت گئے۔ قرآنی تصویریں میری نگاہِ تخیل کے سامنے گھومتی رہیں، مجھے ان میں فنی اعجاز کے آثار نظر آتے تھے، اور یہ داعیہ بھی مجھ میں انگڑائی لینے لگتا کہ اس موضوع کو زیربحث لانے کی ضرورت ہے جس کو ہنوز کسی نے نہیں چھوا۔ چنانچہ خدا کا نام لے کر میں نے کتاب کی تالیف کا آغاز کر دیا۔ میری بحث کا مرکز و محور قرآن تھا، قرآن کی فنی تصاویر کی جمع و تالیف میرا کام تھا، تاکہ میں ان تصاویر کو پیش کروں، تصویرکشی کے طرز و انداز کو واضح کروں اور ان کے کشف و اخراج میں جو فنی تناسب پایا جاتا ہے، اس پر روشنی ڈالوں۔ الغرض میری تمام تر توجہ صرف فنی پہلوؤں تک محدود تھی۔ باقی رہے قرآن کے لغوی، کلامی اور فقہی مباحث تو ان سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا۔

مگر اس دوران مجھ پر ایک نئی حقیقت منکشف ہوئی۔ وہ یہ کہ یہ قرآنی تصاویر قرآن کے دیگر اجزا و عناصر سے کوئی مختلف حیثیت نہیں رکھتیں، بلکہ تصویرکشی اور منظرنگاری اس حسین و جمیل کتاب کے اندازِ بیان کی اصل و اساس ہے۔ یہ وہ بنیادی قاعدہ ہے جس کو جملہ قرآنی موضوعات میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ صرف تشریعی احکام کا موضوع اس سے خارج ہے۔ اب میرا مقصد ان قرآنی تصاویر کی جمع و

ترتیب ہی نہ تھا' بلکہ اصل مقصود اس قاعدہ کا کشف و اظہار تھا جس پر یہ تصاویر مبنی ہیں۔ پوری بحث کی بنیاد میں نے اسی پر رکھی ہے۔ اس قاعدہ کو پیش کر کے اس کے متعلقات کی تشریح کی ہے اور کتاب الٰہی کی اس عظیم خصوصیت کو واشگاف کیا ہے جس کو آج تک چھوا نہیں گیا تھا۔

جب اس تالیف سے فارغ ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے جی میں ایک نیا قرآن جنم لے رہا ہے۔ میں نے قرآن کو قبل ازیں ایسا کبھی نہیں پایا تھا۔ بے شک میرے نزدیک قرآن پہلے بھی جمیل تھا' مگر اس کا حسن و جمال منتشر اور متفرق حالت میں تھا۔ اب مجھے سارا قرآن متحد اور یک جا نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک خاص قاعدہ پر مبنی ہے' اور اس قاعدہ میں عجیب و غریب توافق پایا جاتا ہے۔ یہ وہ بات تھی جو میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھی اور نہ کسی اور نے اس کا تصور کیا تھا۔

قرآن کی سحر طرازی

قرآن کریم نے آغاز نزول سے عربوں کو اپنی سحر طرازی سے مسحور کر لیا تھا۔ اس سے وہ لوگ بھی مسحور ہوئے جن کے سینے کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے کھول دیا اور وہ اس کی آغوش میں آ گئے اور وہ بھی جن کی آنکھوں پر اس نے پردہ ڈال دیا اور وہ نور قرآن سے مستفید نہ ہو سکے۔

حضرت عمرؓ بن الخطاب کے اسلام لانے اور ولید بن مغیرہ کی اسلام سے روگردانی اختیار کرنے کے واقعات ' ایمان و انحراف کے کثیر واقعات میں سے دو عجیب نمونے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے خانہ کعبہ کے پردے کے پیچھے چھپ کر حضورؐ کو سورہ الحاقہ کی تلاوت کرتے سنا اور ان کا دل اسلام کے لیے مسخر ہو گیا۔ دوسری روایت کے مطابق انھوں نے اپنی بہن فاطمہ کے گھر سورہ طٰہ کی چند آیات پڑھیں اور حضورؐ کے پاس پہنچ کر مسلمان ہو گئے: اگرچہ نکلے تھے آپؐ کو قتل کرنے۔

ولید بن مغیرہ نے حضورؐ سے قرآن کا کچھ حصہ سنا' اور اس کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ یہ دیکھ کر قریش کہنے لگے ولید' دین سے پھر گیا۔ ولید کہنے لگا کہ میں قرآن کے بارے میں کیا کہوں؟ بخدا تم میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جو شعر' ترانہ' قصائد حتیٰ کہ جنوں کے اشعار کے بارے میں بھی مجھ سے زیادہ علم رکھتا ہو۔ محمدؐ جو قرآن سناتے ہیں وہ ان میں سے کسی کے ساتھ بھی مشابہت نہیں رکھتا۔ خدا کی قسم' جو کلام ان پر نازل ہوا ہے' اس میں شیرینی پائی جاتی ہے' اس میں تروتازگی اور شادابی کے آثار ہویدا ہیں' جو چیز بھی اس کے مقابل آتی ہے اس کو ریزہ ریزہ کر ڈالتا ہے اور وہ غالب ہے مغلوب نہیں ہے۔

یہ دونوں واقعات اس امر کی کھلی دلیل ہیں کہ قرآن نے آغاز ہی میں اپنے جادو سے عربوں کو مسحور کر لیا تھا' اور اس کا اعتراف اہل ایمان اور کفار سب ہی کو تھا۔

قرآن مجید نے بعض کفار کا جو یہ قول نقل کیا ہے' قرآن کی سحربیانی پر دلالت کے لیے وہ بھی کسی

طرح ان دو واقعات سے کم نہیں ہے۔

لَاتَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (حم السجدہ ۴۱: ۲۶)

ہرگز نہ سنو اور جب یہ سنایا جائے اس میں خلل ڈالو شاید کہ اس طرح تم غالب آجاؤ۔

یہ آیت اس خوف و اضطراب کی نشاندہی کرتی ہے جو ان کے دلوں میں اس لیے جاگزیں تھا کہ مبادا وہ خود یا ان کے ساتھی اور پیروکار اس قرآن سے متاثر ہو جائیں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جونہی محمدؐ یا ان کے رفقا میں سے کسی نے بھی ایک یا دو سورتیں تلاوت کیں تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ اگر وہ قرآن خوانی سے اپنے قلب و ضمیر میں قلق و اضطراب محسوس نہ کرتے تو اپنے متعلقین کو یہ حکم صادر نہ کرتے' اور نہ ہی اپنی قوم کو ایسی تنبیہہ کرتے جو قرآن کی قوتِ تاثیر کی عظیم ترین دلیل ہے۔

یہ بحث نامکمل رہے گی' اگر ان آیات کا تذکرہ نہ کریں جن میں وارد ہوا ہے کہ قرآن نے نازل ہو کر کس طرح لوگوں کو متاثر کیا تھا۔ یہود و نصاریٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد فرمایا:

اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ (المائدہ ۵: ۸۳)

جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسولؐ پر اترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔ وہ بول اٹھتے ہیں کہ پروردگار ہم ایمان لائے ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔

یہ اس وجدانی تاثر کی منظرکشی ہے جو سماعِ قرآن سے ان میں پیدا ہوا۔ اور وہ یہ کہ ان کی آنکھوں سے آنسو اس لیے جاری ہو گئے تھے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔

قرآن حکیم میں دوسری جگہ فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا - وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا - (بنی اسرائیل ۱۷: ۱۰۷'۱۰۸)

جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے انھیں جب یہ سنایا جاتا ہے تو وہ منہ کے بل گر جاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں 'پاک ہے ہمارا رب اس کا وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا۔

قرآن مجید سن کر اللہ سے ڈرنے والوں کی تصویر ان الفاظ میں بھی کھینچی گئی ہے:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (الزمر ۳۹: ۲۳)

اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے' ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزا ہم رنگ ہیں اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں۔ اسے سن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب

سے ڈرنے والے ہیں۔ اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

درج بالا آیات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ قرآنی آیات میں وہ تاثیر موجود ہے جو وجدان کو متاثر کرتی ہے' احساسات و جذبات میں ہیجان پیدا کرتی ہے' اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں باندھ دیتی ہے۔ جو لوگ ایمان لانے کے آرزومند ہوتے ہیں' وہ قرآن کو سنتے ہی اس کے سامنے اپنا سرنیاز جھکا دیتے ہیں۔ جو لوگ کبر و غرور کے مارے اپنے آپ کو اس سے بالا سمجھتے ہیں' وہ بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآن کے عظیم اعجاز کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہتے۔

قرآن میں سحر کا سرچشمہ کیا ہے؟

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب شریعت کی تکمیل نہیں ہوئی تھی' غیبی اخبار کی اطلاع تک نہیں ہوئی تھی' علوم کونیہ کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا تھا' ہنوز قرآن کا وہ قلیل حصہ جو ابتدائی دور میں موجود تھا' ان تمام امور و اوصاف سے خالی تھا جو بعد ازاں اس کے حصہ میں آئے' تاہم اس کے باوجود اس میں افسوں گری اور سحر طرازی کا منبع موجود تھا۔

اس کے جواب میں یہ کہنا پڑے گا کہ جس کو سحر کہا جا رہا تھا وہ قرآن کے تشریعی احکام اور علوم کونیہ کے سوا کسی دوسرے پہلو میں پوشیدہ ہے۔ وہ پہلو قرآن کی نسق و ترتیب ہے۔ اگرچہ یہ امر بھی اپنی جگہ درست ہے کہ اسلامی عقیدہ کی روحانیت اور سادگی میں بلا کی جاذبیت پائی جاتی ہے۔

آیئے ایک سورت ' سب سے پہلی سورت ' "العلق" پر غور کریں۔ اس میں چھوٹے چھوٹے چندرہ فواصل ہیں۔ سرسری نگاہ سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ دور جاہلیت کے کاہنوں کی مسجع عبارت سے ملتے جلتے ہیں جن سے عرب عام طور پر آگاہ و آشنا تھے۔ مگر کاہنوں نے تو چند غیر مرتب اور بے جوڑ جملے یک جا کر رکھے تھے جن میں باہم کوئی ربط و تعلق نہ پایا جاتا تھا۔ تو کیا سورہ العلق میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ تو ایک مربوط و متصل سورہ ہے جس کی آیات میں دقیق قسم کا ربط و نسق پایا جاتا ہے۔ چونکہ یہ قرآن کی اولین سورہ ہے اس لیے اس کا آغاز اقرا (پڑھنا) اور اللہ تعالیٰ کے مبارک و مقدس نام کے ساتھ ہونا ہی چاہیے تھا۔ اقرات مقصود قرآن کی تلاوت ہے۔ اور اللہ کا نام لینے کی ضرورت اس لیے ہے کہ وہی اپنے نام کے ساتھ دین کی دعوت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت رب ہے' یعنی تربیت کنندہ۔ لہٰذا تربیت و تعلیم کے لیے قرات یعنی پڑھنے کا حکم دیا۔ ارشاد فرمایا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ چونکہ ہنوز اسلامی دعوت کا آغاز تھا اس لیے رب کی صفات میں سے اسی صفت کو منتخب کیا جس سے آغاز حیات کا اظہار ہوتا ہے اور وہ اَلَّذِیْ خَلَقَ ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ آغاز حیات میں سے بھی انسانی تخلیق کے اولین اور معمولی مرحلہ سے ابتدا کی کہ انسان کو منجمد خون سے پیدا کیا۔یہ کس قدر چھوٹا اور معمولی آغاز ہے۔مگر اللہ تعالیٰ' جو رب ہونے کے ساتھ ساتھ خالق اور حد درجے کا کریم بھی ہے' اس نے اس لوتھڑے کو انسان کامل کے درجہ تک بلند کر دیا' اور اس کی حالت یہ ہے کہ اسے اگر سکھلایا جائے تو اس میں سیکھنے کی استعداد ودیعت کی گئی ہے۔لہذا فرمایا:

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ - الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ - عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ -

پڑھو اور تمھارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔

دیکھیے' ان آیات میں کس خوب صورتی کے ساتھ انسان کے آغاز سے انجام کی طرف انتقال کیا گیا ہے۔انسانی تخلیق کی منظرکشی کرتے ہوئے آغاز و انجام کے مابین یکے بعد دیگرے جو تدریجی مراحل و ادوار گزرے ان سے صرف نظر کیا گیا ہے' تاکہ انسانی وجدان خود بخود دینی دعوت کی جانب متوجہ ہو اور اپنے قلبی احساسات و جذبات پر بھی غور و فکر کرے۔

قرین عقل و خرد تو یہ تھا کہ انسان از خود خداوند کریم کی اس عظیم عنایت کو پہچانتا اور اس میں یہ احساس کروٹ لیتا کہ وہ کیا تھا اور کیا بن گیا۔مگر ہائے افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى - اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى -

ہرگز نہیں' انسان سرکشی کرتا ہے اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے۔

توقعات کے عین برخلاف انسان سرکش نکلا اور اپنے آغاز و انجام کو بھول گیا بنابریں اسے ان الفاظ میں زجر و توبیخ کی گئی:

اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى -

حالانکہ پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے۔

انسانی تمرد و طغیان کی بات جب چل پڑی تو اس کی تکمیل یوں فرمائی کہ انسان خود سرکشی اختیار نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو بھی اس میں ملوث کرنے کی کوشش کرتا ہے۔فرمایا:

اَرَءَيْتَ الَّذِیْ يَنْهٰى - عَبْدًا اِذَا صَلّٰى -

تم نے دیکھا اس شخص کو جو ایک بندے کو منع کرتا ہے جب کہ وہ نماز پڑھتا ہو۔

کسی شخص کو نماز سے روکنا ایک قبیح فعل ہے۔اس فعل کی قباحت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب نمازی راہ ہدایت پر گامزن ہو اور دوسروں کو بھی تقویٰ کا حکم دیتا ہو۔

اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى - اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى -

تمھارا کیا خیال ہے اگر وہ بندہ راہ راست پر ہو یا پرہیزگاری کی تلقین کرتا ہو۔

اگر یہ منع کرنے والا شخص حق کو جھٹلاتا اور منہ موڑتا ہو۔
غور کیجیے کہ انسان ہر بات سے غافل ہے۔ حتیٰ کہ اسے اپنے آغاز و انجام کی بھی خبر نہیں۔
اَرَءَیْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى - اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى -
کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔
پھر ایسے شخص کو ان الفاظ میں ڈانٹا:
كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ -
ہرگز نہیں اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچیں گے۔ اس پیشانی کو جو جھوٹی اور سخت خطاکار ہے۔

یہ ایسے پر زور الفاظ ہیں کہ خود ان کا تلفظ ہی ان کی معنویت کی نشاندہی کرتا ہے۔ اگر لَنَسْفَعًا کی جگہ اس کا ہم معنی لفظ لناخذن لایا جاتا تو اس میں اس شدت کا مفہوم ہرگز نہ ہوتا جو لَنَسْفَعًا کے لفظ میں موجود ہے۔ اس لفظ سے گویا یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی سرکش اور متکبر شخص کسی اونچی جگہ پر کھڑا ہے اور اس نے کسی شخص کو پوری شدت کے ساتھ پیشانی کے بالوں سے پکڑ رکھا ہے اور اسے گھسیٹے چلا جا رہا ہے۔ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ پیشانی اسی لائق تھی کہ اسے گھسیٹا ہی جاتا۔

گھسیٹے جانے کی حالت میں چونکہ اس بات کا احتمال تھا کہ ایسا شخص مدد کے لیے اپنے اصحاب و رفقا کو پکارتا' اس لیے فرمایا فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ یعنی اپنے یاروں کی مجلس کو بلا لے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم تو سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ہم بھی اپنے موکلان دوزخ کو بلائیں گے۔ یہ سن کر سامع یوں محسوس کرتا ہے گویا دوزخ کے پیادوں اور اس شخص کے اصحاب و رفقا کے مابین جنگ بپا ہے۔ یہ ایک خیالی معرکہ آرائی ہے جو خیالات و تصورات پر چھا جاتی ہے۔ اس لیے یہ اپنی جگہ جاری رہے اور اللہ کا رسول اپنے فرائضِ منصبی ادا کرتا رہے' جو شخص اس کی رسالت کا منکر اور سرکش ہے اس کی بغاوت اور سرکشی کو خاطر میں نہ لائے' چنانچہ فرمایا:
كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ - (العلق: ۱۹)
ہرگز نہیں اس کی بات نہ مانو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کا قرب حاصل کرو۔

اسلامی دعوت کا یہ زبردست آغاز تھا۔ اس سورہ کی آیات بظاہر غیر مرتب اور بے جوڑ آتی ہیں مگر بباطن مربوط و متصل ہیں۔ یہ اولین قرآنی سورہ کا ربط و اتصال ہے جو سرسری نگاہ میں کاہنوں کے انداز کلام سے ملتی جلتی ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ قرآن کریم کی اہم فنی خصوصیات اب تک نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ اس کتاب کے درس و مطالعہ کے لیے غور و فکر کے ایک جدید طرز و منہاج کا اختیار کرنا' اور اس کے جمال

فنی کے اصول عام سے بحث کرنا لازمی ہے ۔ یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ وہ کون سے آثار و علامات ہیں جو قرآن کے حسن و جمال کو ادب عربی سے ممیز کرتے ہیں ۔ قرآن کے فنی اعجاز کا قرآن ہی میں پائے جانے والی منفرد خصوصیات سے ماخوذ ہونا بھی ضروری ہے ۔

یہ بھی پیش نظر رہے کہ اس کتاب عظیم کی خصوصیات پوری کتاب میں پائی جاتی ہیں ۔ تمام اغراض و مقاصد کی تعبیروبیان کا طرز و منہاج بھی ایک ہی ہے ۔ خواہ مقصد بشارت دینا ہو یا عذاب الٰہی سے ڈرانا' کسی کو گذشتہ واقعہ کا بیان مقصود ہو یا آنے والے حادثے کا' کسی کو اطمنان دلانا ہو یا کسی کو ایمان کی دعوت دینا' کسی محسوس چیز کی منظرکشی مطلوب ہو یا غیر محسوس کی' قرآن کے انداز تعبیروبیان میں کوئی فرق نہیں آتا ۔

قرآن مجید کے اندازبیان کا یہی وہ یگانہ و یکتا قاعدہ ہے' جو ہماری اس تحریر کا موضوع ہے ۔ ہم اس قاعدہ کو تصویر فنی کے نام سے موسوم کریں گے ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مخیر علم دوست حضرات سے مالی تعاون کی

"خصوصی اپیل"

ادارہ معارف اسلامی منصورہ ایک دینی، علمی اور تحقیقی ادارہ ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اسے اس غرض کے لیے قائم فرمایا تھا کہ اُمتِ مسلمہ کے قدیم دینی و علمی ورثے کو عصری تقاضوں کے مطابق از سر نو مدوّن کیا جائے اور اسلامی نظام زندگی کے مختلف پہلوؤں پر رہنمائی فراہم کرنے والا مفید لٹریچر تیار کیا جائے۔ الحمد للہ اب تک حدیث، سیرت، فقہ، فقہی انسائیکلوپیڈیا، تاریخ، دعوت، سیاست، معیشت، عمرانیات، سوانح، ادب، صحافت وغیرہ موضوعات پر ڈیڑھ سو کے قریب کتب شائع کی جا چکی ہیں۔ کئی مسودات تیار ہیں، وسائل فراہم ہوں تو شائع کیے جا سکتے ہیں۔

☆ **تفہیم الاحادیث:** سید مودودیؒ۔ دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں مزید چار کا لوازمہ تیار ہے۔

☆ **تفہیم الاحکام:** مفتی سید سیاح الدین کاکا خیلؒ۔ معرکہ آرا فتاویٰ دو جلدوں میں طباعت کے لیے تیار ہیں۔ مطلوبہ سرمایہ: دو لاکھ روپے۔

☆ **احکام القرآن:** ابوبکر جصاص۔ ترجمے کی تین جلدوں کی کتابت کروائی جا چکی ہے۔ طباعت کے لیے مطلوبہ سرمایہ: ۵ لاکھ روپے۔

☆ **شرح احکام العدلیہ:** علی حیدر سابق وزیر انصاف سلطنت عثمانیہ ترکی۔ چار جلدوں کے ترجمے کی کمپوزنگ ہو چکی ہے۔ مطلوبہ سرمایہ: ۵ لاکھ روپے۔

☆ **اعلام الموقعین:** امام ابن القیم الجوزی۔ ترجمے کی دو جلدوں کی طباعت کے لیے مطلوبہ سرمایہ: پونے دو لاکھ روپے۔

☆ **"مسلم دنیا"** : فیض احمد شہابی۔ تیسری جلد کے لیے مطلوبہ سرمایہ ایک لاکھ روپے۔

علاوہ ازیں دیگر اہم کتب تیاری کے مراحل میں ہیں۔ ہمارے مفید اور اہم منصوبوں کو جاری رکھنے میں مالی تعاون فرمائیں۔ یہ صدقہ جاریہ ہوگا اور انشاءاللہ موجب اجر و ثواب ہوگا۔ عطیات ادارہ کے اکاؤنٹ نمبر 84-1692 حبیب بنک لمیٹڈ، وحدت روڈ لاہور میں جمع کرائے جا سکتے ہیں۔

منجانب: محمد اسلم سلیمی ڈائریکٹر ادارہ معارف اسلامی۔ پتا: ادارہ معارف اسلامی منصورہ۔ لاہور
فون نمبر: 28-7570124-7830033 فیکس: 092-042-7832194
ای میل ایڈریس: rasheed @ j i . lhr. erum. com. pk

کلامِ نبویؐ کی صحبت میں

خرم مراد

حضرت ابو سعید الخدریؓ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

میں اپنے بعد تمھارے بارے میں جس چیز سے زیادہ ڈرتا ہوں' وہ یہ ہے کہ تمھارے لیے دنیا کی بہار اور زینت کو کھول دیا جائے گا۔

ایک آدمی نے کہا: یارسول اللہؐ کیا بھلائی [دنیوی ساز و سامان اور خوش حالی] برائی کو ساتھ لائے گی؟

حضورؐ خاموش ہوگئے' یہاں تک کہ ہم نے سوچا کہ آپؐ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ [کہتے ہیں] پھر آپؐ نے پسینہ پونچھا' اور فرمایا: سوال کرنے والا کہاں ہے؟ گویا آپؐ نے اس کی تعریف کی' پھر فرمایا:

نہیں' بھلائی برائی کو نہیں لاتی۔ لیکن جیسے بہار سبزہ اگاتی ہے [جو خیر ہے]' مگر اس سے جانور مر بھی جاتے ہیں' یا ہلاکت کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ ہاں' سوائے ایسے جانور کے جس نے صرف اتنا گھاس کھایا کہ اس کی کوکھیں تن گئیں' پھر وہ دھوپ میں بیٹھا' گوبر کیا' پیشاب کیا' اس کے بعد چراگاہ کی طرف واپس آیا' اور دوبارہ گھاس کھایا' [اس کے حصے میں خیر ہی آتا ہے]۔

اسی طرح یہ دنیا کا مال ہے' جو سرسبز و شاداب ہے' شیریں ہے۔ اس دنیا کو جو حق کے ساتھ حاصل کرے' حق کے ساتھ رکھے' یہ اس کی خوب مدد کرنے والی ہے۔ لیکن جو اسے ناحق حاصل کرے وہ اس جانور کی طرح ہے جو کھاتا چلا جاتا ہے مگر سیر نہیں ہوتا' اور یہ مال قیامت کے دن اس کے خلاف گواہ بن کر کھڑا ہو گا۔ (بخاری، مسلم، بحوالہ مشکوٰۃ، باب الرقاق)۔

دنیا کی کوئی بھی چیز' کوئی بھی فطری خواہش' فی نفسہ نہ اچھی ہے نہ بری' نہ خیر نہ شر۔ لیکن اس لحاظ سے خیر ہے کہ بندے کے لیے ایک آزمایش ہے اور آخرت کا لازوال و لامتناہی اجر کمانے کا ذریعہ۔

وہ ' رضائے الٰہی کے مطابق مال استعمال کرے یا اپنی خواہش پوری کر لے ' تو وہ اس کے لیے آخرت کی بہار و زینت کا سامان ہے ۔ اللہ کو بھول کر ' اس کی مرضی کے خلاف ' استعمال کرے یا خواہش پوری کرے ' تو یہاں بھی اسے چوراچوراہی ہو جاتا ہی ہے ' آخرت میں بھی وہ اس کے لیے ہمیشہ کا آزار اور عذاب ہے ۔

دنیا کی چیزوں میں سب سے زیادہ دل کش و دل نواز اور محبوب و مطلوب مال و دولت ہے ' خوش حال ہے ' دنیا کی زینت کا سازو سامان ہے ۔ یہ کسی طرح بھی قابل نفرت اور قابل ترک و اجتناب نہیں ' اس لیے کہ یہی آخرت کمانے کا ذریعہ ہے ۔ دیکھیے ' پوچھنے والے نے بھی اسے خیر سمجھا ' حضورؐ نے بھی اسے خیر قرار دے کر ہی جواب دیا ۔ موسم بہار کے سبزے اور پھل پھول کی طرح ۔

شر اور برائی ' دنیا اور اس کی دولت و زینت کی وجہ سے نہیں پیدا ہوتی ۔ یہ اس شخص کے لیے باعث شر بن جاتی ہے ' جو اس کو حاصل کرنے اور خرچ کرنے میں نہ حق کا خیال کرتا ہے نہ حد کا ۔ بے تحاشا حاصل کرتا ہے ۔ سونے سے بھری ہوئی دو وادیاں بھی ہوں تو اس کی ہوس اور بڑھ جاتی ہے سینت سینت کر رکھتا ہے اور گنتا ہے اور کسی مستحق کو دمڑی بھی نہیں دیتا ۔ جانور بھی اس طرح گھاس کھائیں تو ہلاک ہو جائیں ' حالانکہ گھاس تو اس کی صحت ' قوت اور بقائے زندگی کا ذریعہ ہے ۔

حضورؐ بعض اوقات جواب دینے کے لیے وحی کا انتظار فرماتے گویا قرآن کے علاوہ بھی آپ پر وحی نازل ہوتی ۔ آپؐ سوال کرنے والوں کی ہمت افزائی فرماتے ' کہ سوال ہی سے علم و فہم کے دروازے کھلتے ہیں ۔

○

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

میں اپنی امت کے بارے میں جن چیزوں سے سب سے زیادہ ڈرتا ہوں وہ یہ ہیں کہ میری امت خواہشات پوری کرنے میں لگ جائے گی ' اور دنیاوی آرزوؤں کے حصول کے لیے لمبے چوڑے منصوبے بنانے میں مشغول ہو جائے گی ۔ خواہش نفس کی پیروی اس کو حق [کو ماننے اور اس پر عمل کرنے] سے روک دے گی ' اور دنیا سازی کے لیے منصوبے اسے آخرت کو بھلا دیں گے ۔

اے لوگو ' یہ دنیا کوچ کر چکی ہے ' اور [پیٹھ پھیرے] دور بھاگی چلی جا رہی ہے ' اور آخرت کوچ کر چکی ہے اور [سامنے سے] قریب چلی آ رہی ہے ۔ ان میں سے ہر ایک کے بیٹے ہیں [جو اس سے محبت کرتے ہیں] پس ' اگر تمہارے بس میں ہو ' دنیا کے بیٹے نہ بنو ۔

آج تم دار العمل میں ہو ' آج [عمل کا وقت ہے] کوئی حساب نہیں ۔ کل تم [حساب کے لیے] آخرت میں ہو گے ' اس وقت عمل کا کوئی موقع نہ ہو گا ۔ (بیہقی ، بحوالہ مشکوٰۃ ، باب الرقاق)

ہوئی وہی خواہش ہے جو حدود الٰہی سے بے نیاز یا ان کے خلاف ہو۔ ایسی خواہش کے پیچھے پیچھے چلنے سے آنکھیں، حق بات کو یا کسی کا حق دیکھنے کے لیے، اندھی ہو جاتی ہیں، دل ماننے کے لیے بند ہو جاتا ہے۔ یہ بہت بڑی گم راہی ہے۔

ہر وقت دنیا کی فکر میں لگے رہنا، دنیا کے لیے منصوبے بنانا، اس دنیا کے لیے، جس کا اگلی سانس تک بھی اعتبار نہیں، لمبے لمبے منصوبے بنانا، یہ "طولِ امل" حماقت کی بھی انتہا ہے، آج دنیا میں جو کچھ کرنا ہے، یعنی آخرت کے لیے عمل، اس سے بھی غافل کر دیتی ہے، کل آخرت میں آج کے عمل کا جو حساب دینا ہے، اس کا خیال بھی ذہن سے محو کر دیتی ہے۔

حماقت کی انتہا اس لیے ہے کہ دنیا، جس کے لیے تن من دھن لگا ہوا ہے، وہ تو ہر لمحہ ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے، دور بھاگی چلی جا رہی ہے، آخرت کے لیے عمل کا موقع برابر ہاتھ سے نکلا چلا جا رہا ہے، اور آخرت، جہاں دنیا کا حساب دینا ہو گا، اور جہاں کے لیے منصوبے اور فکر سے وہاں کا اجر و انعام حاصل بھی ہو سکتا ہے، وہ منہ کیے سامنے سے برابر قریب چلی آ رہی ہے۔

پس دنیا میں بھرپور زندگی گزارو، خوب کام کرو، لیکن آخرت کے چاہنے والے بنو، آخرت کے بیٹے بنو، آخرت کو دنیا کے ہر عمل کا مقصود و مطلوب بناؤ۔

○

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چالیس نیکیاں ہیں! ان میں سب سے اعلیٰ نیکی یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کو اونٹنی عاریتاً دے دو تاکہ وہ ایک وقت اس کا دودھ دوہ کر پی لے۔ جو شخص ان میں کسی نیکی پر بھی عمل کرتا ہے اس طرح کہ وہ عمل کے ثواب کی پکی امید رکھے، اور جس امر کا وعدہ کیا گیا ہے اس کو سچ مانے اللہ تعالیٰ اسے اس نیکی کی بنا پر جنت میں داخل کر دے گا۔ (بخاری، بحوالہ ریاض الصالحین، باب کثرۃ طرق الخیر)

نیک اعمال میں اصل وزن اخلاص اور للہیت سے پیدا ہوتا ہے۔

بظاہر اعلیٰ ترین نیکی مثلاً فی سبیل اللہ شہادت، یا تعلیم قرآن۔۔ جہنم میں لے جائے گی اگر غیراللہ کے لیے ہو، نام و نمود ہو، مال و دولت ہو، قوم و وطن ہو، یہ سب غیراللہ ہیں۔

بظاہر بہت چھوٹی اور حقیر نیکی اگر صرف اجرِ الٰہی کی پکی امید اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے وعدوں پر سچے یقین کے ساتھ ہو، تو وہ جنت میں لے جائے گی۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مومنوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان اس کا ہے 'جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔ اور تم میں سب سے اچھے لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے لیے اچھے ہیں (ترمذی، بحوالہ ریاض الصالحین' باب حسن الخلق)

حسن اخلاق اور کمال ایمان میں لازم و ملزوم کا تعلق ہے۔ ایمان' دل کا فعل ہے' دل میں پوشیدہ ہے' صرف زبان سے اقرار کی بنیاد پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کو جانچنے کا پیمانہ آدمی کے اخلاق ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ اخلاق اچھے ہوں مگر اندر ایمان نہ ہو یا ناقص ہو۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ ایمان موجود ہو اور اچھا ہو' مگر اخلاق برے ہوں۔

ایمان کی بلندی اور کمال کی کوئی حد نہیں' اسی طرح اچھے اخلاق کی بھی کوئی حد نہیں۔

اخلاق میں' یہاں' سب سے زیادہ اہم اخلاق عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک اور برتاؤ ہے۔ سب سے بہتر لوگ وہ ہیں جو ان عورتوں کے ساتھ' جو نازک ہیں' زیر دست ہیں' جن کے ساتھ گھر کی دیواروں کے پیچھے کچھ بھی کیا جا سکتا ہے' جو حرف شکایت زبان پر نہیں لاتیں یا لا سکتیں' ان عورتوں کے ساتھ نرمی' محبت' بھلائی' اکرام' عزت اور ادائگی حقوق کی روش اختیار کریں۔

○

حضرت معاذ بن جبلؓ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس طرح بھیڑیا' بکریوں کا دشمن ہوتا ہے' اور اپنے ریوڑ سے الگ ہو کر دور چلے جانے والی تنہا بکری کو بہ آسانی شکار کر لیتا ہے' اسی طرح شیطان' انسان کا بھیڑیا ہے۔

تو اے لوگو' اپنی اپنی پگ ڈنڈیوں پر الگ الگ مت چل پڑنا' بلکہ ہمیشہ جماعت اور عامۃ المسلمین کے ساتھ رہو۔ (احمد، بحوالہ مشکوٰۃ)

آدمی جماعت سے الگ ہو جائے تو وہ تنہا رہ جاتا ہے۔ کسی کا ساتھ' کسی کی نگاہ' کسی کی زبان' کسی کی شرم اس کو غلط راہ سے روکنے یا صحیح راہ پر چلنے میں مدد نہیں کرتی۔

تنہا آدمی آسانی کے ساتھ شیطان کے لیے تر نوالہ بن جاتا ہے۔

اپنی اپنی رائے اور اپنی اپنی راہ نہ چلو۔

"جماعت کے ساتھ رہو" یعنی الجماعت کے ساتھ۔ الجماعت نہ ہو تو؟ جماعت بناؤ تا کہ الجماعت وجود میں آئے' اور شیطان سے جتنی حفاظت ممکن ہو' وہ ہو سکے۔

نصیحت کے اسلامی آداب

ڈاکٹر مصطفیٰ السباعیؒ
ترجمہ: محمد ظہیر

ہم میں سے کون ہے جس سے غلطی نہ ہوتی ہو۔ ہماری طبیعت و فطرت کچھ اس قسم کی بنی ہے کہ ہم ہدایت و گمراہی اور خیر و شر کی طرف مائل ہوتے رہتے ہیں۔ ہر انسان اس قابل نہیں کہ اسے اپنی غلطی معلوم ہو سکے یا وہ اپنی غلط روی کا احساس کر سکے' لہٰذا ایک بھائی کا دوسرے بھائی پر یہ حق ہے کہ وہ اسے' اس کے عیبوں سے آگاہ کرے اور اسے نصیحت کرے۔ جس طرح حاکم کا ظلم دیکھ کر' اس کے ظلم و سرکشی پر متنبہ کرنا ضروری ہے' اسی طرح اپنے دوست کو نصیحت کرنا بھی ضروری ہے جب معلوم ہو کہ وہ اپنے آپ پر یا کسی اور پر زیادتی کر رہا ہے۔ جس روز لوگ بھائی کا بھائی پر نصیحت کا جو حق ہے' اسے چھوڑ دیں گے تو ان کے باہمی تعلقات خراب ہو جائیں گے۔ قرآن حکیم بتاتا ہے کہ بنی اسرائیل لعنت' محرومی اور جلاوطنی کے اس لیے مستحق ہوئے کہ انھوں نے باہمی نصیحت و خیر خواہی کو خیرباد کہہ دیا تھا۔

"جن لوگوں نے بنی اسرائیل میں سے کفر کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور حد سے بڑھ جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو برے کام سے' جو وہ کرتے تھے' روکتے نہ تھے" (المائدہ ۵:۷۸'۷۹)۔ جب اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہوا: وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً "اور اس فتنہ سے بچاؤ کرو جس کی شامت خاص کر ان لوگوں تک ہی نہ پہنچے گی جو تم میں سے ظالم ہیں" (الانفال ۸:۲۵)۔ تو بعض صحابہؓ نے رسول اللہؐ سے پوچھا: کیا ہم ہلاک ہو جائیں گے حالانکہ ہم میں نیک لوگ بھی ہوں گے! فرمایا: "ہاں! جب وہ منکرات دیکھیں اور منع نہ کریں"۔

امت کی ترقی و استحکام اور افراد امت کے ضمیر و قلب کی طہارت و استقامت کی سب سے بڑی ضمانت باہمی نصیحت اور خیر خواہی ہے۔ بھائی' بھائی کو نصیحت کرے۔ پڑوسی' پڑوسی کا خیال رکھے۔ باپ بیٹے کو' استاد شاگرد کو نصیحت کرے۔ ملازم اپنے افسر کا خیر خواہ ہو اور حکمران اپنی قوم کی فلاح و

بہبود کے خواہاں ہوں۔ اس صورت میں آپ دیکھیں گے کہ حقوق کا احترام کیا جا رہا ہے' بلند اخلاق پر عمل درآمد ہو رہا ہے اور لوگ ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں۔ نہ خیانت ہے نہ ملاوٹ' نہ ایک دوسرے پر تہمتیں لگائی جاتی ہیں' نہ ایک دوسرے کی کردار کشی کی جاتی ہے۔ جب معاشرہ نصیحت سے عاری ہو جائے یا اس پر عمل کمزور ہو جائے' تو امت' فساد اور باہمی عداوت و انتشار کے بدترین حالات کا شکار ہو جائے گی۔

بہت سے لوگ نصیحت کی حدود کا خیال نہیں رکھتے۔ کوئی تو نصیحت سے آگے بڑھ کر تشہیر کرنے لگتا ہے اور کوئی مدارات سے گر کر خوشامد پر اتر آتا ہے اور یوں شر' خیر سے بڑھ جاتا ہے اور حق' باطل کے لیے استعمال ہونے لگتا ہے۔

جب آپ نصیحت کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوں یا آپ سمجھتے ہوں کہ نصیحت کرنے سے نقصان پہنچنے اور برائی پھیلنے کا احتمال ہے تو آپ نصیحت کرنے سے باز رہیں' اور جب متعلقہ شخص کو نصیحت کرنے کے لیے حالات سازگار ہو جائیں تو پھر آپ نصیحت کریں۔ یہ مدارات ہے اس کے برعکس اگر آپ برائی کی حوصلہ افزائی کریں اور بدکار کی تائید کریں تو اسے تملق کہا جاتا ہے۔ اگر آپ ایک اوباش حکمران کی ہاں میں ہاں ملائیں' اس کی بے راہ روی کو خوب صورت بنا کر پیش کریں اور اس کے فسق و فجور کو جاری رکھنے کے لیے اس کی حمایت کریں تو یہ تملق و خوشامد ہے جسے شریعت و اخلاق ناپسند کرتے ہیں۔ خوشامد کمینگی و بزدلی ہے اور مدارات عقل مندی و حکمت ہے۔

نصیحت کرنے کے کئی مراحل ہیں:

سب سے پہلے یہ کہ آپ کے دوست' پڑوسی یا کسی بھی شخص کے متعلق جو کچھ کہا جائے آپ فوراً اس کو سچ نہ مان لیں۔ لوگوں کی عادت ہے کہ وہ برائی کے پھیلانے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ عام لوگ کسی کے بارے میں حسن ظن سے کام لینے کی بجائے بدگمانی کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہر کہی ہوئی بات کو سچ نہ سمجھیں' خواہ آپ نے یہ بات ایک ہزار منہ سے بھی کیوں نہ سنی ہو' تا آنکہ آپ چشم دید گواہ سے نہ سن لیں' اور عینی گواہ کی بھی تصدیق نہ کریں جب تک آپ کو اس کی بے غرضی و بے لوثی کا یقین نہ ہو۔

جب آپ کے دوست کے بارے میں آپ تک کوئی بات پہنچے تو ہمیشہ اسے اچھے پہلو پر محمول کریں اور اس کا روشن رخ ہی دیکھیں۔ یہی دوستی کا حق ہے اور یہی مکارم اخلاق کے شایان شان ہے۔ عبداللہ بن مطیع کی صاحبزادی نے اپنے خاوند طلحہ بن عبدالرحمن بن عوف سے جو اپنے زمانہ میں قریش کے سب سے بڑی سخی تھے' کہا: میں نے تمھارے بھائیوں سے زیادہ کمینہ کوئی نہیں دیکھا۔ حضرت طلحہؓ نے پوچھا' وہ کیسے؟ بیوی نے جواب دیا: "میں نے دیکھا ہے کہ جب آپ کے پاس مال

و دولت کی فراوانی ہوتی ہے تو وہ آپ کے ساتھ لگے رہتے ہیں اور تنگدستی آتی ہے تو آپ کو چھوڑ دیتے ہیں"۔ انھوں نے کہا: اللہ کی قسم یہ تو ان کا عمدہ اخلاق اور کمال شرافت ہے۔ جب ہم ان کی عزت و تکریم کے قابل ہوتے ہیں تو وہ ہمارے یہاں تشریف لاتے ہیں اور جب ہم ان کا حق ادا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں تو وہ ہمیں زحمت نہیں دیا کرتے"۔ دیکھیے طلحہ نے اپنے بھائیوں کے رویہ کی کیسی عمدہ توجیہ کی اور بظاہر بدسلوکی و بے رخی کو وفاو شرافت قرار دیا۔

نصیحت کرنے کے سلسلہ میں دوسری بات یہ ہے کہ آپ لوگوں کی طبیعتوں کا صحیح اندازہ کریں۔ وہ نہ فرشتے ہیں اور نہ انبیا۔ آپ اپنے کسی بھی بھائی کے بارے میں یہ توقع نہ کریں کہ اس سے لغزش یا غلطی نہیں ہوگی۔ آپ اسے انسانی طبیعت و سرشت قرار دیجیے جس کے غلبہ و تسلط سے بہت کم لوگ بچتے ہیں۔ ذرا خود اپنی ذات میں جھانکیے کیا آپ سے اس قسم کی کوتاہیاں اور لغزشیں سرزد نہیں ہوتیں؟ پھر آپ اس بات کی توقع دوسروں سے کیوں کرتے ہیں جو خود آپ کے اندر نہیں پائی جاتی۔ نفس انسانی کی حقیقت کو قرآن کریم نے کس بلیغ انداز میں پیش کیا ہے: وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ۔ "اور میں اپنے نفس کو پاک نہیں ٹھیراتا کیونکہ نفس تو یقیناً بدی کا حکم دیتا رہتا ہے، مگر جس پر میرا رب رحم کرے" (یوسف ۱۲: ۵۳)۔

اگر آپ اس حقیقت کو سامنے رکھیں گے تو آپ اپنے دوست کو اس کی غلطی پر نہ تو معتوب کریں گے اور نہ ہی اس کو حقیر و ذلیل سمجھیں گے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا: "کوئی ایسا مسلمان نہیں ہے جو اللہ کی اطاعت ہی کرتا ہو اور کبھی اس کی نافرمانی نہ کرتا ہو اور نہ کوئی ایسا ہے جو صرف نافرمانی ہی کرتا ہو اور اطاعت نہ کرتا ہو۔ پس جس کی اطاعت اس کی نافرمانیوں سے بڑھ گئی وہی عادل ہے"۔ یہ ہے فقہ، علم اور حکمت، جس سے صرف وہی لوگ واقف ہو سکتے ہیں جو سب سے زیادہ پرہیزگار، دین میں مضبوط اور اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔ وہ شخص اس حقیقت سے کیسے آگاہ ہو سکتا ہے جو نافرمانوں کو ذلیل سمجھے، گنہگاروں کو حقیر قرار دے اور اپنے تقویٰ و عبادت کے زعم میں اپنے آپ کو دوسروں سے افضل خیال کرے۔ مومن کامل تو وہ ہے جو لوگوں پر رحم کرے، خطاکاروں پر شفقت کرے، ان کی غلطیوں کے لیے عذر اور بہانہ تلاش کرے اور ایک مشفق معالج کی طرح انھیں نصیحت کرے۔ آپ نے کبھی ایسا طبیب بھی دیکھا ہے جو مریض کو حقیر و ذلیل سمجھتا ہو یا اپنے آپ کو مریض سے برتر سمجھے؟ لاکھوں سلام ہوں معلمؐ انسانیت پر جنھوں نے فرمایا: "کسی مسلمان کے برا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے"۔

نصیحت کرنے کے سلسلے میں تیسری بات یہ ہے کہ آپ جس معاملے کو ناپسند کر رہے ہیں اور اسے غلطی و انحراف سے تعبیر کر رہے ہیں، کہیں یہ آپ کا ذاتی نقطہ نظر تو نہیں؟ آپ اس بارے میں اپنے

ذاتی نقطہ نظر سے فیصلہ نہ کیجیے بلکہ متعلقہ شخص کے نقطہ نظر سے بھی اس کا جائزہ لیجیے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ شخص اپنی رائے میں اجتہاد سے کام لے رہا ہو اور جو کام کر رہا ہو وہ اس نے خیر سمجھ کر اختیار کیا ہو' لہٰذا اس کو ناپسند کرنے میں عجلت سے کام نہ لیجیے۔ جب تک اس کی درست تعبیر ہو سکتی ہے اور اس پر حق کی دلیل قائم ہو سکتی ہو' اسے غلط قرار دینا مناسب نہیں۔ اس طرح کی باتوں میں فقہائے کرام کا مسلک یہ ہے کہ اگر کسی رائے یا عمل میں ننانوے وجوہ اس کی تکفیر کی متقاضی ہوں اور ایک وجہ تکفیر کی متقاضی نہ ہو تو ہم اس ایک وجہ کو لیں گے اور اس رائے یا عمل والے کو کافر قرار دینے سے باز رہیں گے۔ یہیں سے علما نے یہ ضابطہ بنایا ہے کہ نہی عن المنکر کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ اجتہاد کا محل نہ ہو اور نہ ہی اس بات میں علما کا اختلاف ہو۔ اگر یہ شرط نہ پائی جائے تو پھر اس کو ناپسندیدہ قرار دینا جائز نہیں ہے۔ یہ سب اس لیے کہ کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے انسان پر اپنے عقیدہ یا رائے کو مسلط کرے یا یہ سمجھے کہ اس کی رائے ہی سب سے بہتر ہے اور اسی کا اجتہاد برحق اور باطل سے مبرا ہے۔

نصیحت کے سلسلے میں چوتھا قدم یہ ہے کہ جب آپ کو غلطی کا یقین ہو جائے اور تاویل و توجیہ یا شبہ کی گنجائش نہ رہے تو اب آپ پر فرض عائد ہو جاتا ہے کہ آپ متعلقہ شخص کو تنہائی میں نصیحت کریں' نہ کہ لوگوں کے سامنے۔ یہ نصیحت آپ کے اور اس شخص کے درمیان راز ہو۔ نفس انسانی کبھی اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اسے اس کے عیبوں سے آگاہ کیا جائے۔ جب آپ اپنے بھائی کو علیحدگی میں نصیحت کریں گے تو اس کے قبول کرنے کی زیادہ توقع ہے۔ نیز یہ آپ کے خلوص کی بھی شہادت ہے۔ جب آپ علانیہ نصیحت کریں گے تو اس میں کینہ' تشہیر اور اپنے علم و فضل کے اظہار کا شبہ ہو گا اور یہ ایک پردہ ہے جو نصیحت کے سننے اور قبول کرنے میں حائل ہوتا ہے۔ رسول اللہؐ کا طریقہ مبارکہ تھا کہ جب آپ کسی برائی پر تنبیہہ کرنا چاہتے تو برائی کا ارتکاب کرنے والوں کا نام نہیں لیتے تھے' بلکہ فرمایا کرتے تھے: مَابَالُ اَقْوَامٍ یَفْعَلُوْنَ کَذَا' ان لوگوں کا کیا حال ہے جو یہ یہ کام کرتے ہیں۔ اس سے متعلقہ افراد خود بخود سمجھ لیتے تھے کہ حضورؐ کی یہ نصیحت ان کے لیے ہی ہے۔ یہ ہے نصیحت و تربیت کا وہ بلند ترین اسلوب' جس کی رہنمائی ہمیں مربی اکبر حضرت محمدؐ نے فرمائی۔ ایک شخص نے حضرت علیؓ سے بر سر عام کہا: اے امیرالمومنین آپ نے فلاں فلاں غلطی کی ہے اور میں آپ کو ان ان باتوں کی نصیحت کرتا ہوں۔ حضرت علیؓ نے اس سے فرمایا: "اگر تم مجھے نصیحت کرنا چاہتے تھے تو تم مجھے علیحدگی میں نصیحت کرتے جہاں صرف تم اور میں ہوتے۔ جب تم مجمع عام میں' مجھے نصیحت کر رہے ہو تو مجھے نہ تمھارے بارے میں اعتبار و یقین ہے اور نہ اپنے بارے میں"۔ یہ ہے بھی حقیقت' تنہائی میں رازداری کے ساتھ نصیحت کرنے میں محبت و شفقت ہے اور علانیہ نصیحت توہین و رسوائی۔

امام شافعیؒ کا قول ہے: "جس نے اپنے بھائی کو تنہائی میں نصیحت کی تو اس نے نصیحت کی اور عزت و تکریم کی اور جس نے علانیہ نصیحت کی اس نے اپنے بھائی کی توہین کی اور اسے رسوا کیا"۔

ایک دن خلیفہ منصور' لوگوں کو اللہ کی اطاعت کرنے اور اس کی نافرمانی سے بچنے کی تلقین کر رہا تھا۔ ایک شخص نے اٹھ کر کہا "اے امیرالمومنین! تم اللہ کی اطاعت اور اس کی نافرمانی سے بچنے کی نصیحت کیے جانے کے زیادہ لائق ہو' سو اللہ سے ڈر اور اس کے غضب سے بچ"۔ منصور نے کہا: "اللہ کی قسم! میں جو نصیحت کر رہا تھا' اس سے میرا مقصد صرف اللہ کی رضا تھی' لیکن تمھارا ارادہ یہ ہے کہ تمھارے بارے میں کہا جائے کہ اس شخص نے امیرالمومنین کے سامنے کھڑے ہو کر انھیں نصیحت کی"۔ خلیفہ منصور نے نفس کی دسیسہ کاریوں اور پوشیدگیوں اور شہوتوں سے کیسے خبردار کیا ہے کہ کبھی کبھی زہد و پرہیزگاری اور نصیحت اور کلمہ حق کہنے میں جرات بھی نفسانی شہوت کے باعث ہوا کرتی ہے۔ لوگوں کے عیبوں کی تشہیر کرنا اور محفلوں میں ان کی پردہ دری کو نصیحت اور کلمہ حق کے برملا اظہار سے تعبیر کرنا' اللہ کے دین سے بے خبری اور جہالت کی نشانی ہے۔ یہ تو غیبت ہے جس سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہمیں روکا ہے۔ نصیحت تو یہ ہے کہ جب آپ کا بھائی غلطی کرنے لگے تو آپ اسے سمجھائیں اور جب وہ گناہ کرے تو اسے سمجھائیں۔ غیبت یہ ہے کہ آپ اس کی عدم موجودگی میں ایسی بات کہیں جسے وہ ناپسند کرے۔

ہاں اگر آپ ایک انسان کو بار بار نصیحت کریں اور وہ آپ کے سمجھانے کے باوجود گناہ کرنا نہ چھوڑے اور یہ شخص ایسا ہو جس کی پیروی کی جاتی ہے یا لوگ اس کی بات سنتے ہیں تو اب آپ کے لیے جائز ہے کہ لوگوں کے سامنے اس کی حالت کو بیان کر دیں تاکہ لوگ اس کی پیروی سے محفوظ رہیں۔ نہ کہ آپ اسے بدنام کرنا شروع کر دیں۔ کسی کے گناہوں کو اچھالنا' کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے' خواہ اس کا سبب کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ آپ کا حق ہے کہ آپ فعل بد کو ناپسند کریں لیکن اس فعل کو سرانجام دینے والے کی تشہیر کرنا آپ کے لیے ہرگز روا نہیں۔ اس کی تعلیم ہمیں خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے' جب رسول اکرمؐ سے فرمایا ہے: فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ "سو اگر وہ تیری نافرمانی کریں' تو' تو کہہ دے 'میں اس سے بری ہوں جو تم کرتے ہو"۔ (الشعرا ۲۶:۲۱۶) اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو لوگوں کے عمل سے بری الذمہ ہونے کا حکم دیا ہے نہ کہ خود ان سے۔ یہ ہدایت اس لیے دی گئی ہے کہ اسلام لوگوں کو بدنام کرنے کو ناپسند کرتا ہے' کیونکہ تشہیر ہا ہمی عداوت اور بغض کا سبب بنتی ہے اور نفرت و تفریق کو ہوا دیتی ہے۔

نصیحت کا پانچواں مرحلہ یہ ہے کہ جس چیز کو آپ ناپسند کرتے ہیں' کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی اصلاح کی خاطر' آپ کی نصیحت سے کوئی بڑی خرابی پیدا ہو جائے' جیسے کوئی فتنہ اٹھ کھڑا ہو یا معصیت

میں اضافہ ہو جائے یا جماعت کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے۔ یہ اس قسم کی باتیں ہیں جن کا شر چھوٹے بڑے ' نیک و بد ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ ایک شخص کے انفرادی عمل کو روکنے سے اگر پوری جماعت کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ رسول اللہؐ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا "اگر میری قوم نئی نئی اسلام نہ لائی ہوتی تو میں بیت اللہ کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بنیادوں پر تعمیر کرواتا اور دو دروازے بنواتا۔ ایک سے لوگ داخل ہوتے اور دوسرے سے باہر نکلتے"۔ حضورؐ کے اس عمل سے کہ آپ خانہ کعبہ کی تعمیر میں اصلاح اس لیے نہیں فرماتے کہ کہیں لوگوں کے دین میں فتنہ نہ پیدا ہو جائے ' یہ سبق ملتا ہے کہ کسی چھوٹے شر کے ازالہ سے اس لیے احتراز کیا جائے کہ اس سے بڑا شر نہ پھیل جائے اور چھوٹے نقصان کو ختم کرنے سے کہیں بڑا نقصان نہ ہو جائے۔

جب یہ پانچوں مراحل آپ نے طے کر لیے اور آپ نے دیکھا کہ نصیحت کرنا ضروری ہے ' تو آپ کا فرض ہے کہ آپ نرمی اور حکمت سے کام لیتے ہوئے ایسے انداز سے نصیحت کریں کہ مخاطب متنفر نہ ہو اور نہ وہ یہ سمجھے کہ آپ اپنے آپ کو اس سے بڑا سمجھتے ہیں ' یا آپ اس کے استاد ہیں۔ انھی آداب کی تلقین کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَ الْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ "اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلایئے اور ان کے ساتھ ایسے طریقے پر بحث کیجیے جو نہایت عمدہ ہو" (النحل ۱۶: ۱۲۵)۔

صحابہؓ نے ہمیں رسول اللہؐ کے بارے میں بتایا ہے کہ آپ کسی کے سامنے ایسی بات نہ کرتے تھے جو اسے ناپسند ہو ' کیوں کہ نصیحت میں جب نرمی نہیں رہتی تو اس میں سختی پیدا ہو جاتی ہے ' جس سے دل نفرت کرتے ہیں اور پھر نصیحت کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ اس قسم کی نصیحت لوگوں کو خیر سے دور رکھتی ہے اور انھیں نصیحت کرنے والے کے قریب نہیں آنے دیتی۔

آج ہمیں نصیحت کے آداب و شرائط کا خیال رکھنے کی شدید ضرورت ہے۔

اسلامی قانون

ایک عمومی تعارف

دوسری اور آخری قسط

محمود احمد غازی

انسانی زندگی پر محیط یہ جامع ہدایت نامہ فقہ اسلامی کے وسیع و عمیق اور بے مثال ذخیرہ سے عبارت ہے۔ فقہائے اسلام نے تعلیم و تفہیم کی سہولت کی خاطر اس کے مضامین و مندرجات کو متعدد انداز سے تقسیم کیا ہے۔ بعض حضرات اس کی تقسیم عبادات اور عادات کے دو عمومی موضوعات کی تحت کرتے ہیں۔ یعنی وہ احکام جن کا مقصد اللہ اور بندہ کے درمیان تعلق کو مضبوط بنانا ہے اور وہ احکام جو بندوں کے مابین تعلقات کو منضبط کرتے ہیں۔ بعض دیگر حضرات نے امور تعبدی اور امور تابدی کی اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں۔ کچھ اور حضرات نے عبادات' عادات اور معاملات کی سہ گانہ تقسیم کو زیادہ موزوں قرار دیا ہے۔

تاہم دور جدید کے فقہائے اسلام کا رجحان زیادہ تفصیلی تقسیم کا ہے۔ وہ فقہ کے موضوعات و مضامین کو جدید مغربی قانون کی اصطلاحات میں بیان کرنا موزوں سمجھتے ہیں جس کا سب سے بڑا فائدہ قانون دان حضرات اور جج صاحبان کی بہ سہولت تفہیم ہے۔ جن حضرات نے جدید قانونی اصطلاحات میں یہ تقسیمیں کی ہیں ان میں شام کے نامور فقیہ استاذ علامہ مصطفیٰ احمد الزرقا' عراق کے فقیہ ڈاکٹر عبدالکریم زیدان' مصر کے ڈاکٹر عبدالسلام مدکور اور بہت سے دوسرے حضرات شامل ہیں۔ لیکن یہاں یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ اگرچہ یہ تقسیمیں نئی ہیں' لیکن یہ مضامین اور ان کی قدیم اصطلاحات اتنی ہی قدیم ہیں جتنی خود فقہ اسلامی قدیم ہے۔ پہلی صدی ہجری کے اواخر سے فقہی مضامین کو پیش کرنے کی جو ترتیب اختیار کی گئی تھی وہ آج تک چلی آرہی ہے۔ اور بہت کم فقہی کتابیں ایسی ملیں گی جن میں اس ترتیب سے انحراف کیا گیا ہو۔ اگر کوئی فرق کہیں نظر آتا ہے تو وہ عام طور پر جزوی قسم کا ہی ہے' بنیادی اور جوہری قسم کا نہیں ہے۔

یہ کہنا تو بڑا دشوار ہے کہ فقہی کتابوں کی یہ ترتیب سب سے پہلے کس فقیہ نے قائم کی لیکن یہ بات واضح ہے کہ فقہ کی قدیم ترین کتابوں (امام مالک، امام محمد بن حسن الشیبانی اور امام شافعی وغیرہ کی تصانیف) میں فی الجملہ یہی ترتیب اختیار کی گئی ہے۔ اس ترتیب میں ایک عقلی اور منطقی ارتقا پایا جاتا ہے۔ ایک عام مسلمان کو جن مسائل و معاملات سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سابقہ پڑتا ہے وہ سب سے پہلے بیان کیے جاتے ہیں۔ پھر بالتدریج جیسے جیسے اپنی اہمیت کے اور انسان سے اپنے سابقہ کے لحاظ سے مضامین آتے ہیں فقہ کی کتابوں میں ان کی بحثیں آتی جاتی ہیں۔ اس لیے عموماً سب سے پہلے طہارت اور پھر نماز کے احکام بیان ہوتے ہیں اور پھر درجہ بدرجہ دوسرے احکام کا نمبر آتا ہے۔

اس ترتیب اور استاد زرقا اور ڈاکٹر عبدالکریم زیدان کی تقسیم کے لحاظ سے فقہ کی کتابوں کے مندرجات کو درج ذیل بڑے بڑے عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ عبادات۔ یہ فقہ اسلامی کا اولین موضوع ہے جس سے فقہ کی ہر کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔ عبادات میں ترتیب کے اعتبار سے پہلے نماز، پھر روزہ پھر زکوٰۃ اور آخر میں حج کا تذکرہ آتا ہے۔ اس ترتیب میں یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ ذاتی اور انفرادی طور پر ادا کی جا سکنے والی عبادات پہلے آئیں اور پھر بالتدریج وہ عبادات آئیں جو اجتماعیت کی شان زیادہ رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ عبادات پہلے آتی ہیں جن کی فرضیت کا دائرہ نسبتاً وسیع تر ہے اور وہ عبادات بعد میں آتی ہیں جن کا فرضیت کا دائرہ نسبتاً محدود ہے۔ مثال کے طور پر نماز کو لیجیے۔ یہ عبادت ہر شخص انفرادی طور پر ہی ادا کرتا ہے اور عام حالات میں یہ اللہ اور بندے کے درمیان ایک خصوصی رشتے کے طور پر ہی قائم رہتی ہے جس میں ریاست یا کوئی ریاستی ادارہ کوئی مداخلت نہیں کرتا۔ تاوقتیکہ کوئی شخص یا گروہ ترک نماز کی مجاہرت نہ شروع کر دے یعنی علی الاعلان ترک نماز کرے اور رائے عامہ کے ردعمل کو حقیر جان کر نظرانداز کرے۔ اس کے بعد روزہ کو لیجیے۔ یہ اگرچہ انفرادی طور پر ہر ایک کا اپنا اپنا فعل ہے لیکن اس میں اجتماعیت کی ایک عجیب شان پائی جاتی ہے۔ اس میں ریاست کی مداخلت کی حدود اور سطح نماز کے مقابلہ میں ذرا زیادہ لیکن زکوٰۃ کے مقابلے میں کم ہے۔ زکوٰۃ وہ عبادت ہے جو انفرادی طور پر ادا ہی نہیں کی جا سکتی۔ اس میں کم از کم ایک شخص کی موجودگی ضروری ہے جو زکوٰۃ وصول کر کے آپ کو زکوٰۃ ادا کرنے کا موقع فراہم کرے۔ آخر میں حج کا مرحلہ آتا ہے جس میں اسلام کی بین الاقوامیت اپنی بھرپور شکل میں سامنے آتی ہے۔ ان سب عبادات کے تفصیلی احکام سے فقہ کے جس حصہ میں بحث ہوتی ہے اس کو فقہ العبادات کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ مناکحات، احوال شخصیہ یا فقہ الاسرہ: یہ فقہ کا وہ حصہ ہے جو انسان کی عائلی زندگی کو منظم و

منضبط کرتا ہے۔فقہ الاسرہ کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن پاک کی کل آیات احکام کا (جن کی تعداد کا اندازہ ۲۵۰ ـ ۳۰۰ کے درمیان ہے) کم و بیش ایک تہائی یا اس سے کچھ زائد صرف شخصی اور عائلی قوانین سے متعلق ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے نظام معاشرت و قانون میں ادارہ خاندان کو بڑی بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے۔یہی وجہ ہے کہ خاندان اور نسل کا تحفظ اسلام کے پانچ بنیادی مقاصد میں سے ایک قرار دیا جاتا ہے۔قرآن مجید میں ایسی کاوشوں کو کافرانہ سحر کاری کہا گیا ہے جن کا مقصد خاندان کے دو بنیادی ستونوں' شوہر اور بیوی' کے درمیان دوری اور تفریق پیدا کرنا ہو۔رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے بھی ایسی کوششوں کو ابلیسی کوششیں قرار دیا ہے جن کے ذریعہ شوہر اور بیوی میں نفرت کے بیج بوئے جائیں۔یہی وجہ ہے کہ فقہائے اسلام نے خاندان میں خوش گوار تعلقات کے فروغ اور شوہر اور بیوی میں محبت کا جذبہ استوار کرنے کی کوششوں کو نفل عبادات سے بڑھ کر ٹھیرایا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور امت کی تکوین میں سب سے بنیادی اکائی خاندان ہی ہے۔اگر خاندان کی اکائی مضبوط اور اسلامی اساس پر قائم ہے تو وہاں سے جو افراد تیار ہوں گے وہ بنیادی دینی تربیت کے حامل ہوں گے اور ایسے خاندان سے جو معاشرہ بنے گا وہ اسلامی اساس سے قریب تر ہوگا۔

فقہ الاسرہ یا عائلی قوانین کے ذیل میں نکاح' طلاق' وراثت' وصیت' نفقہ اور حضانت کے ابواب سے بحث ہوتی ہے۔یعنی ادارہ خاندان وجود میں کیسے آئے گا' اگر وجود میں آنے کے بعد اختلافات جنم لینے لگیں تو ان کو کیسے دور کیا جائے۔مرنے والے کی جایداد افراد خاندان میں کیسے اور کس تناسب سے تقسیم کی جائے اور افراد خاندان کی ضروریات کی تکمیل اور مفادات کی نگہداشت کیسے کی جائے۔قطع نظر اس کے کہ افراد خاندان کا مذہب اور عقیدہ کیا ہے' ان کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی ضروریات کی تکمیل' شریعت کے احکام کا بنیادی تقاضا ہے۔

۳۔ معاملات: منطقی اور واقعاتی ترتیب کے اعتبار سے دیکھا جائے تو گھریلو زندگی کے بعد انسان کی معاشرتی زندگی آتی ہے جس میں اس کو لوگوں سے لین دین' خرید و فروخت اور مال و دولت سے متعلق معاملات کرنے پڑتے ہیں۔یہ معاملات دو طرح کے ہوتے ہیں: کچھ تو وہ جن میں فریقین کے قانونی حقوق و فرائض مرتب ہوتے ہوں اور کچھ وہ جن کے نتیجہ میں ایسے قانونی حقوق و فرائض مرتب نہ ہوتے ہوں جن کو عدالتوں کے ذریعہ نافذ کرایا جاسکتا ہو۔ان میں سے پہلی قسم کا اصطلاحی نام فقہ المعاملات ہے۔یہ فقہ اسلامی کا سب سے وسیع اور سب سے عمیق میدان ہے۔عام طور پر آج کل کے جدید فقہا اس کو اسلام کا دیوانی قانون قرار دیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ دیوانی قانون یا سول لا کے نام سے یورپ میں بالعموم اور فرانس میں بالخصوص قانون کے جس شعبہ کو دیوانی قانون کہا جاتا ہے

اس کا بڑا حصہ فقہائے اسلام کی تقسیم کی رو سے معاملات میں زیر بحث آتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ فقہ المعاملات کا دائرہ جتنا وسیع ہے اس کے لحاظ سے اس کو دیوانی قانون کے مترادف قرار دینا درست نہیں معلوم ہوتا۔

فقہ المعاملات میں وہ تمام احکام شامل ہیں جن کا تعلق افراد یا گروہ کے مابین لین دین اور تجارتی قسم کے تعلقات سے ہے۔ آج کل عرب فقہا نے فقہ المعاملات کو بہت سی ذیلی شاخوں میں تقسیم کیا ہے جن میں سے چند یہ ہیں:

الف۔ فقہ مالی: یعنی فقہ کے وہ احکام جو اسلام کے مالیاتی نظام کو منظم و منضبط کرتے ہیں۔ اس میں اسلام کا تصور مال' مال کی قسمیں' حصول مال' توسیع مال وغیرہ کے احکام شامل ہیں۔

ب۔ فقہ اقتصادی: یعنی فقہ کے وہ احکام جو اسلام کے معاشی اور اقتصادی نظام کو منظم و منضبط کرتے ہیں۔ اس میں ملکیت کا تصور' ریاست کے ذرائع آمدنی' محاصل عامہ' ریاست کی معاشی ذمہ داریاں وغیرہ زیر بحث آتی ہیں۔ اس شاخ کے بعض احکام سے اسلام کے دستوری اور انتظامی قانون میں بھی بحث کی جاتی ہے۔

ج۔ فقہ تجارتی: یعنی فقہ کے وہ احکام جو اسلام کے تجارتی نظام کو منظم و منضبط کرتے ہیں۔ اس میں تجارت اور کاروبار کی قسمیں' کاروباری شریکوں کے باہمی روابط' مشترکہ یا انفرادی کاروبار' مشترکہ کاروبار کی صورت میں متعلقہ شرکا کے حقوق اور ذمہ داریوں سے بحث کی جاتی ہے۔ اسی عنوان کے تحت اسلام میں کارپوریٹ قانون کے تصور پر بھی بحث ہوتی ہے۔ فقہائے اسلام نے زمانہ قدیم سے ذمہ داری کے محدود یا غیر محدود ہونے اور اس کی بہت سی صورتوں سے بھی بحث کی ہے۔

۴۔ فقہ العقود: یعنی اسلام کا قانون معاہدہ۔ اس میں معاہدوں کی قسموں ان کے احکام اور نتائج و ثمرات سے بحث کی جاتی ہے۔ فقہائے اسلام نے جن معاہدہ جات سے اپنی کتابوں میں بحث کی ہے ان کو چار زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۔ عقود المعاوضہ' یعنی وہ معاہدے جن میں ایک فریق دوسرے فریق کو اس کی کسی خدمت کا معاوضہ پیش کرتا ہے۔ ۲۔ عقود المشارکہ' یعنی وہ معاہدے جن میں دونوں فریق کسی مشترک مقصد کے لیے شریک ہوں۔ ۳۔ عقود التوثق' یعنی وہ معاہدے جن کا مقصد ایک فریق کو دوسرے فریق کے واجب الادا حقوق کی ادائیگی کا پابند بنانا ہو۔ مثلاً معاہد رہن۔ ۴۔ عقود المبادلہ: یعنی وہ معاہدے جن کا مقصد دو فریقوں کے مابین جائیداد کا تبادلہ ہو۔ بعض حضرات اس قسم کو عقود المعاوضہ ہی کی ایک قسم قرار دیتے ہیں۔

اسقاطات و ابرات: یعنی فقہ المعاملات کا وہ حصہ جو انسان کے ان تصرفات سے بحث کرتا ہے جن کا مقصد اپنے کسی حق کو ساقط کرنا یا دوسرے پر عائد ہونے والی ذمہ داری سے ان کو بری کرنا ہو۔

و۔ ذمہ اور التزامات: یعنی وہ مالی ذمہ داریاں (liabilities) جو انسان پر عاید ہوتی ہیں اور ان کے نتیجہ میں بہت سے صورتیں کاروبار اور معاہدہ جات وغیرہ کی سامنے آتی ہیں۔

۴۔ الاحکام السلطانیة: سیاست شرعیہ یا فقہ دستوری، یہ فقہ اسلامی کا چوتھا بڑا میدان ہے جو اسلام کے دستوری اور انتظامی قانون سے بحث کرتا ہے۔ مسلم مفکرین اور فقہا کے نزدیک قانون اور نظام کی پابندی انسان کی بنیاد اور سرشت میں داخل ہے۔ وہ انسان کو محض معاشرتی حیوان نہیں مانتے بلکہ ایک ایسا سیاسی حیوان مانتے ہیں جو قانون اور نظم وضبط کی شعوری پابندی کرتا ہے۔ رومی قانون دانوں نے بھی شاید مسلمانوں کے اثر سے یہ کہا کہ جہاں معاشرہ ہو گا وہاں قانون بھی ہو گا۔ پھر جہاں قانون ہو گا وہاں قانون بنانے والے اور چلانے والے بھی ہوں گے۔ پھر وہاں قانون کو نافذ کرنے والے اور قانون کو توڑنے پر سزا دینے والے بھی ہوں گے۔ یہ فقہ اسلامی کا وہ شعبہ ہے جو بجا طور پر اسلام کا دستوری اور انتظامی قانون کہلاتا ہے۔ اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں (ان میں سے متعدد کتابیں الاحکام السلطانیہ اور سیاست شرعیہ کے نام سے موسوم ہوئیں) وہ دستوری فکر، دستوری قانون اور دستوری نظائر کے ساتھ ساتھ انتظامی قانون سے بھی بحث کرتی ہیں۔ انتظامی قانون کے ضمن میں ایسے معاملات بھی زیر بحث آتے ہیں جو قبل ازیں فقہ المعاملات میں ذکر کیے جا چکے ہیں۔ مثلاً فقہ مالی کے وہ مسائل جو ریاست کے فرائض سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ ماوردی (متوفی ۴۵۰ھ) نے اپنی کتاب الاحکام السلطانیہ میں محاصل عامہ وغیرہ سے متعلق بہت سے ایسے مباحث شامل کیے ہیں جو اصلاً فقہ مالی سے تعلق رکھتے ہیں۔

۵۔ فقہ الجنایات: یعنی اسلام کا فوج داری قانون۔ جہاں قانون ہو گا وہاں قانون کو توڑنے والے بھی ہوں گے۔ قرآن مجید سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی معاشرہ ایسا نہیں گزرا جس میں جرائم کا ارتکاب کرنے والے ناپید ہو گئے ہوں۔ بہترین سے بہترین معاشروں میں بھی جرائم کا ارتکاب ہو جاتا ہے۔ جرائم کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان کو کم سے کم سطح پر لے آیا جائے، معاشرہ میں جرم کا ارتکاب انتہائی استثنائی صورت ہو جس سے معاشرے کا مزاج ابا کرتا ہو اور عام لوگ اس سے نفرت کرتے ہوں۔ جرم کا ارتکاب علانیہ نہ ہو، ایک بار جرم ہو جانے پر قرار واقعی سزا دی جائے اور دوسرے ممکنہ مجرمین کے لیے اس کو عبرت اور مثال بنا دیا جائے۔

جرائم کی سزائیں اور ان کا قانون وضع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے جرم کا تعین کیا جائے اور کسی فعل کو کب، کن حالات میں اور کن شرائط کے تحت جرم قرار دیا جائے گا۔ وہ اسباب اور بنیادیں کون اور کن اصولوں کی اساس پر متعین کرے گا جن کی روشنی میں کسی فعل کو جرم قرار دیا جائے۔ پھر جو افعال جرم قرار دیے جائیں گے ان کی سزائیں کیا ہوں گی اور ان کا تعین کون اور کن

اصولوں کی بنیاد پر کرے گا' پھر سزائیں کب اور کن حالات میں دی جائیں گی اور کب اور کن حالات میں ان کو معاف یا ختم یا کم کیا جاسکے گا۔

اس باب میں شریعت نے جو بنیادی احکام دیے ہیں ان کی رو سے اول انسانوں کے حقوق و فرائض کی وضاحت کی گئی ہے۔ حقوق للہ اور حقوق العباد کا تذکرہ ہے اور ان حقوق کی وضاحت ہے جن میں اللہ اور بندوں دونوں کے حقوق پائے جاتے ہیں۔ ان تینوں قسم کے حقوق کے الگ الگ احکام اور تقاضے ہیں جن کی بنیاد پر جرائم کی تین تقسیمیں بنتی ہیں۔ پھر کچھ جرائم ایسے ہیں جو ہر معاشرہ میں پائے جاتے ہیں اور دنیا کا کوئی علاقہ یا ملک ان سے خالی نہیں ہوتا۔ جیسے چوری' بدکاری' قتل' نشہ بازی وغیرہ۔ ایسے جرائم کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ دوسری قسم کے جرائم وہ ہیں جو خاص خاص علاقوں' ملکوں' معاشروں یا حالات میں پیدا ہوتے ہیں اور ہر جگہ عام نہیں ہوتے۔ مثلاً ملاوٹ اور رشوت کے جرائم کہ وہ بعض علاقوں اور معاشروں میں پائے جاتے ہیں اور بعض میں نہیں پائے جاتے۔ اس نوعیت کے جرائم تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں۔

ان میں سے پہلی نوعیت کے جرائم کی سزائیں شریعت نے متعین کر دی ہیں اور وہ ہمیشہ کے لیے طے شدہ ہیں۔ ان سزاؤں کو اصطلاحاً حدود کہا جاتا ہے۔ دوسری نوعیت کے جرائم کی سزائیں شریعت نے خود متعین کر دینے کے بجائے ان کا تعین کرنے کا کام معاشرہ کے سپرد کر دیا ہے۔ اب یہ اس متعلقہ معاشرہ یا علاقہ کے ارباب حل و عقد کی ذمہ داری ہے کہ وہ جرم کی نوعیت' وسعت اور اثرات کو دیکھ کر اس کی کوئی مناسب سزا مقرر کر دیں۔ سزاؤں کی اس قسم کو تعزیر کہا جاتا ہے۔ حدود کے برعکس تعزیری سزائیں ہمیشہ کے لیے طے شدہ نہیں ہیں بلکہ معاشرہ کے ارباب حل و عقد حالات و ضروریات کے پیش نظر ان میں مناسب ردوبدل کرتے رہنے کے مجاز بلکہ مکلف ہیں۔

پھر حقوق للہ اور حقوق العباد کے حوالے سے بھی جرائم کی تقسیمیں ہیں۔ جن جرائم میں حقوق العباد کا پہلو غالب قرار دیا گیا ہے ان میں بندوں کو معاف کر دینے کا اختیار نہیں ہے۔ پہلی قسم کے جرائم میں قتل اور انسانی جان کے خلاف تمام جرائم شامل ہیں جن میں قصاص اور دیت کی سزائیں دی گئی ہیں۔ دوسری قسم کی سزاؤں میں حدود شامل ہیں۔ تعزیرات اگرچہ بیشتر حقوق اللہ میں شامل ہیں لیکن ان میں حاکم وقت کو معاف کرنے یا کمی کرنے کا اس لیے اختیار ہے کہ یہ سزائیں اسی کی مقرر کی ہوئی ہیں۔

۶۔ فقہ اسلامی کا چھٹا بڑا میدان ادب القاضی ہے جس کو بعض جدید عرب مصنفین فقہ المرافعات کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ یہ اسلامی قانون کا وہ شعبہ ہے جس کو آج کل کی اصطلاح میں قانون ضابطہ یا پروسیجرل لا (procedural law) کہا جاسکتا ہے۔ اس عنوان کے تحت فقہائے اسلام

حسب ذیل موضوعات سے بحث کرتے ہیں:

الف۔ نظام قضا عدلیہ جو اسلام کے نظام عدل و احسان کے قیام کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام میں عدلیہ اور قضا کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن پاک میں خلافت کا سب سے بڑا اور اولین فریضہ اور مقصد لوگوں کے درمیان حق و انصاف کے مطابق مقدمات کے فیصلے کرنا قرار دیا گیا ہے۔ (سورہ ص: ۲۴)۔ عربی زبان میں حکومت اور عدلیہ کے لیے ایک ہی لفظ ہے (حکم، حکومہ، محکمہ) جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربی اسلامی مزاج یہ ہے کہ نظام حکومت میں قاضی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ قضا کے زیر عنوان فقہائے کرام منصب قضا کی اہمیت، کار قضا کی فضیلت، قاضی کے تقرر، قاضی کی شرائط، منصب قضا کی طلب، قاضی کے فرائض، قاضی کے عزل و تقرر، آداب عدالت، عہدہ داران عدالت، قاضی کی مراعات جیسے اہم موضوعات کا ذکر کرتے ہیں۔

ب۔ دعویٰ اور دعوی کے فریقین، وہ امور جن کا فیصلہ کرنے کے لیے عدالت میں جانا ضروری ہے اور وہ امور جن کا فیصلہ کرانے کے لیے عدالت میں جانا اور دعویٰ دائر کرنا ضروری نہیں، دعویٰ کے اسباب، ارکان اور شرائط، دعویٰ کے مندرجات، تعارض و تناقض وغیرہ۔

ج۔ سماعت اور فیصلہ کا طریقہ کار، دائرہ اختیار، سمن اور طلبی، آداب کمرہ عدالت، جواب دعویٰ، فیصلہ، حوالات اور حبس احتیاطی، فریق کی غیر حاضری میں فیصلہ، فیصلہ سے رجوع، فیصلہ پر نظر ثانی، فیصلہ کے اثرات۔

د۔ ثبوت اور گواہی، بینہ اور ثبوت، شہادت، نصاب شہادت، اوصاف گواہاں، گواہی کی شرائط، تزکیۃ الشہود، گواہوں کا اختلاف اور تضاد بیانی، قرینہ قاطعہ، ماہرین فن کی آرا، سرکاری اور عدالتی دستاویزات بطور ثبوت، اقرار، قسم، نکول (قسم کھانے سے انکار) وغیرہ۔

ھ۔ نیم عدالتی ادارے۔ حسبہ، ولایت مظالم، ولایت جرائم، نظام افتا، تحکیم اور ثالثی، وکالت اور قانونی مشورہ ادب القاضی کے مندرجات و موضوعات کے اس مختصر خاکہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کا دائرہ کار مغربی پروسیجرل لا کے مقابلے میں خاصا وسیع ہے۔ اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ کسی کو مجرم قرار دینے یا بری کرنے کا کام حکمرانوں کی صواب دید پر نہ چھوڑا جائے کہ وہ جس کو چاہیں مجرم قرار دے دیں اور جس کو چاہیں سزا سنا دیں۔ بلکہ اس کے لیے ایک باقاعدہ قانونی ضابطہ اور اصول و قواعد ہوں جن کے بموجب کسی شخص کو مجرم یا بری قرار دیا جائے۔ اسی قانونی ضابطے اور انھی اصول و قواعد کے مجموعہ کا نام ادب القاضی ہے۔ یہ بات بلا خوف و تردد کہی جاسکتی ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں پروسیجرل لا کو ایک الگ اور جداگانہ قانونی علم کے طور پر سب سے پہلے مسلم فقہا نے مرتب کیا۔ دوسری صدی ہجری کے اواخر سے ادب القاضی کے موضوع پر الگ سے کتابیں لکھنے کی

ضرورت مسلمان فقہا نے محسوس کر لی تھی۔ امام ابو حنیفہ کے دو نامور شاگردوں امام ابو یوسف اور امام حسن بن زیاد اللولوی نے ادب القاضی کے نام سے کتابیں لکھی تھیں جو افسوس ہے کہ ہم تک نہیں پہنچ سکیں۔ اس وقت اس موضوع پر جو قدیم کتاب دستیاب ہے وہ تیسری صدی کے حنفی امام ابوبکر خصاف (متوفی ۲۱۶ھ) کی کتاب ادب القاضی ہے جو دنیا کے ذخیرۂ قانون میں پروسیجرل لا پر قدیم ترین کتاب ہے۔

اس گزارش کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ دوسری اقوام اور تہذیبوں میں پروسیجرل لا کا کوئی تصور مسلمانوں سے پہلے نہیں پایا جاتا تھا، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ عرض کرنا ہے کہ امام خصاف سے قبل کسی قانون دان نے صرف پروسیجرل لا کے موضوع پر الگ سے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ رومن قانون، حمورابی کے کوڈ، یہودی قانون، قدیم ہندو شاستروں میں بلاشبہ پروسیجرل اور ضابطہ کے احکام و قواعد ملتے ہیں لیکن وہ بنیادی قانون (substantive-law) کے قواعد میں اس طرح رلے ملے اور مخلوط ہیں کہ ان کو بعض صورتوں میں تو الگ الگ متمیز کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ ان قوانین میں یہ اندازہ کرنا دشوار ہوتا ہے کہ اصل اور بنیادی قانون کہاں ختم ہوتا ہے اور قانون ضابطہ کہاں شروع ہوتا ہے۔

۷۔ سیر یا الفقہ الدولی، اسلام کا بین الاقوامی قانون یا قانون بین الممالک۔

ادب القاضی کی طرح سیر کے بارے میں بھی بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انسانی تاریخ میں مسلمان فقہا نے پہلی بار بین الاقوامی قانون کو ایک باقاعدہ قانونی علم کے طور پر مدون کیا۔ یہ بات تاریخ اور ریکارڈ کا حصہ ہے جس کو مغربی اور مشرقی مصنفین دونوں نے تسلیم کیا ہے کہ امام محمد بن الحسن الشیبانی (متوفی ۱۸۹ھ ۸۰۵ء) کی کتابیں کتاب السیر الصغیر اور کتاب السیر الکبیر تاریخ قانون میں بین الاقوامی قانون کے موضوع پر مستقل بالذات لکھی جانے والی قدیم ترین کتابیں ہیں جو اپنی اصل صورت میں ہم تک پہنچی ہیں۔ مغربی دنیا میں ڈچ قانون دان ھیوگو گروشس (متوفی ۱۶۴۵ء مطابق ۱۰۵۵ھ) کو بین الاقوامی قانون کا باوا آدم (فادر آف انٹرنیشنل لا) مانا جاتا ہے۔ اس کی کتاب جس پر اس کی شہرت اور اس لقب کا دارومدار ہے یعنی قانون جنگ و صلح ۱۶۲۵ عیسوی میں منظر عام پر آئی تھی۔ جبکہ گروشس کی وفات سے تقریباً آٹھ سو چھیاسٹھ سال قبل امام محمد بن الحسن الشیبانی مذکورہ بالا دونوں کتابیں مرتب کر چکے تھے اور وہ دنیائے اسلام میں وسیع پیمانہ پر مقبول ہو چکی تھیں۔

امام محمد بن الحسن الشیبانی اور ان کے ہم عصر دوسرے فقہاکرام کی تصانیف سے قبل دنیا کی کسی قوم میں بین الاقوامی قانون پر مستقل بالذات کتابوں کا ذکر نہیں ملتا۔ اسلام سے قبل یا تو سرے سے جنگ و صلح کا کوئی قانون نہیں تھا یا عموماً مذہبی کتابوں میں دوسری بہت سی ہدایات کے ساتھ ساتھ

جنگ و صلح کے بارے میں ہدایات ملتی ہیں۔ بعض جدید مصنفین نے خاصی تگ و دو کے بعد اپنی اپنی اقوام میں انٹرنیشنل لا کے ابتدائی عناصر کا کھوج لگایا ہے۔ ایک مشہور ہندو مصنف ٹینڈن نے انٹرنیشنل لا پر ایک درسی کتاب مرتب کی ہے جس میں اس نے وید، گیتا اور رامائن سے بین الاقوامی تعلقات کے بہت سے اصول دریافت کیے ہیں۔ ان کاوشوں کی علمی اہمیت کے باوجود وید، گیتا اور رامائن کو بین الاقوامی قانون کی کتابیں قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح بعض دوسرے مصنفین نے بائبل، تورات اور انجیل سے بین الاقوامی قانون کے احکام نکالے ہیں۔ ایسے احکام تورات میں خاصے زیادہ ہیں لیکن اس کے باوجود تورات کو بین الاقوامی قانون کی کتاب کوئی نہیں سمجھتا۔

یہی بات حمورابی اور جسٹی نین کے قوانین کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ ان دونوں مجموعوں میں سے بعض ایسے احکام نکالے جا سکتے ہیں جو ضابطہ کے قوانین یا بین الاقوامی قانون کے اصول قرار دیے جا سکیں لیکن ان دونوں مجموعوں کو بین الاقوامی قانون یا قانون ضابطہ کے مجموعے قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۸۔ فقہ التعمل الاجتماعی یا معاشرتی سطح پر میل جول اور طرز عمل کے احکام جن کے لیے الحظر و الاباحتہ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے، یعنی عام معاشرتی سطح پر کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز ہے۔ قانون کے اس شعبہ کا مقصد بنیادی طور پر اسلامی معاشرہ کے امتیازی اوصاف کا تحفظ اور اسلامی شخصیت کی بقا ہے۔ دنیا کے ہر نظام، ہر قانون اور ہر تہذیب کی طرح اسلام بھی اپنے نظام، قانون اور تہذیب کی انفرادیت کا تحفظ کرتا اور اس کے لیے مناسب اور ضروری تدابیر اختیار کرتا ہے۔ الحظر و الاباحتہ کے احکام اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے ہیں۔ نہ صرف اسلام بلکہ دیگر مذاہب بالخصوص ہندومت اور یہودیت میں بھی ایسے احکام ملتے ہیں جن کا مقصد ان مذاہب کی انفرادیت کا تحفظ ہے۔

مزید برآں اسلامی معاشرہ ایک کثیر العناصر معاشرہ ہے۔ یہ کثیر العنصری (pluralism) لسانی، قبائلی، علاقائی انداز کی بھی ہے اور ثقافتی، بلکہ مذہبی انداز کی بھی۔ اسلامی تعلیمات میں جس طرح کے معاشرہ کا تصور ملتا ہے اس میں اہل ذمہ بھی ہوں گے، مستامنین اور معاہدین بھی ہوں گے۔ وہاں اہل کتاب اور آتش پرستوں کو بھی رہنے کی آزادی حاصل ہوگی، وہاں مختلف طبقات اور گروہوں کو اپنی اپنی لسانی، علاقائی اور ثقافتی انفرادیت کے تحفظ کی آزادی حاصل ہوگی۔ اس صورت حال کو معاشرتی سطح پر جس قانون کے ذریعہ منظم و منضبط کیا جائے گا وہ یہی فقہ المجتمع یا معاشرتی فقہ ہے۔

پھر اسلام ایک دعوتی دین ہے۔ اس میں ہر مسلمان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ دین کی تعلیم اور پیغام کو دوسروں تک پہنچائے۔ اس اعتبار سے اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو مسلسل وسعت پذیر ہے۔ اس کے پیروکاروں کی تعداد دنیا میں مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مذہب کے پیروکار اپنے کسی

خول میں بند نہیں رہ سکتے۔ دوسروں سے بیزار رہ کر کوئی وسعت پذیری کے اس تسلسل کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کا مزاج تفتح (کھلے پن) اور تنور (روشنی میں آنے) کا ہے انغلاق اور انظلام (بند اور تاریک ہونے) کا نہیں ہے۔ اس تفتح اور تنور کو اگر بالکلیہ آزاد چھوڑ دیا جائے تو یہ بہت جلد بے قابو ہو کر پورے اجتماعی نظام کو تباہ و برباد کر سکتا ہے' جیسا کہ حال ہی میں سوویٹ یونین کے تجربہ سے پتا چلتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ تفتح اور تنور کو مناسب حدود کا پابند بنایا جائے۔ یوں تو پوری شریعت ہی ایک پہلو سے ان حدود سے عبارت ہے لیکن خاص اجتماعی سطح پر الحظر و الا باحتہ کے احکام کی صورت میں یہی حدود متعین کی گئی ہیں۔

دنیا کے بعض مذاہب (مثلاً یہودیت اور ہندومت) میں یہ احساس بڑی شدت سے پایا جاتا ہے کہ اگر ان کے نظام میں دوسری تہذیبوں اور نظریات کو آزادی دی گئی تو اس سے ان کی انفرادیت متاثر ہوگی یا ان کا تشخص مجروح ہوگا۔ اس لیے وہ دوسرے نظریات اور تہذیبوں کے بارے میں بڑا غیر مصالحانہ اور جنگجویانہ رویہ رکھتے ہیں۔ بابری مسجد اور حرم ابراہیمی کے واقعات سے اس کی تائید ہوسکتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام کو ایسا کوئی خطرہ نہیں۔ نہ دوسروں کے ساتھ رہنے سے اس کی انفرادیت ختم ہوتی ہے اور دوسرے مذاہب کو آزادی دینے سے اس کا اپنا تشخص مجروح ہوتا ہے۔ اسلام کی دعوت تمام بنی آدم کے لیے عام ہے۔ اس کے ضابطہ میل جول میں ہر گروہ اور ہر مذہب کے ماننے والوں سے میل جول کی گنجائش موجود ہے۔ میل جول کے اس ضابطہ کو ایک کثیر العناصر انسانی معاشرہ کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس ضابطہ میں کھانے پینے کے آداب' حلال و حرام کی تفصیلات' عام معاشرتی سطح پر افراد کا میل جول' غیر مسلموں سے روابط کے انداز' شادی بیاہ کے طریقے اور حدود' لباس اور پردہ کے احکام' رہن سہن کے اصول و قواعد' عام برتاؤ اور اس جیسے دیگر امور سے بحث کی جاتی ہے۔

یہ تھا اسلامی قانون کا ایک مختصر سا موضوعاتی جائزہ۔

اس جائزے سے چند باتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں: پہلی بات یہ کہ انسانی زندگی کے اہم اور بڑے پہلوؤں میں سے کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو انسان کے ظاہری اعمال--- اقوال و افعال سے--- تعلق رکھتا ہو اور وہ فقہ اسلامی کے مذکورہ بالا آٹھ شعبوں میں سے کسی شعبہ میں شامل نہ ہو۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانی زندگی کی ہر سرگرمی کے بارے میں اسلامی شریعت ایک واضح موقف رکھتی ہے جس کے مطابق وہ سرگرمی وقوع پذیر ہونی چاہیے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے یا اسلام زندگی کے تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہے تو اس سے ہماری مراد یہی ہوتی ہے۔ اسلام مذکورہ بالا تمام معاملات و مسائل کے حل کے لیے ہدایات فراہم کرتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اسلامی قانون کے یہ سارے شعبے اس طرح ایک دوسرے سے مربوط ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان سب شعبوں میں وہی تعلق ہے جو ایک زندہ جسم کے اعضا میں ہوتا ہے۔ ان تمام شعبوں میں ایک ہی روح کارفرما ہے جو شروع سے آخر تک تمام احکام و مسائل میں جاری اور ساری ہے۔ ان سب شعبوں میں خیالات و تصورات کی ایک یکسانیت اول سے آخر تک ہر جگہ نظر آتی ہے۔ ان تمام شعبوں کے احکام کو جو بنیادی اصول و قواعد مرتب کرتے ہیں وہ ایک ہی ماخذ و مصدر سے لیے گئے ہیں۔ لہٰذا فقہ اسلامی ایک ایسی وحدت ہے جس کے مختلف حصوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔

تیسری بات یہ کہ اسلامی قانون بیک وقت ایک خالص مذہبی قانون بھی ہے اور عدالتی اور ملکی قانون بھی۔ اس میں ایک مذہبی قانون کے تمام مثبت اور صحت مند عناصر موجود ہیں لیکن دنیا کے دیگر مذہبی قوانین میں در آنے والی خرابیوں سے پاک ہے۔ اسی طرح اس میں کسی بھی ریاستی اور عدالتی قانون میں پائے جانے والے تمام مثبت اور صحت مند عناصر موجود ہیں اور یہ ان خرابیوں سے مبرا ہے جو دوسرے سیکولر نظاموں کا خاصہ ہیں۔

دنیا کے دیگر رائج الوقت قوانین یا تو خالص مذہبی قوانین یا خالص ریاستی اور عدالتی نوعیت کے ہیں جن کی بنیاد کسی رواج، کسی بادشاہ کے حکم یا کسی بالاتر مقتدرہ کے فیصلہ پر ہوتی ہے۔ لیکن اسلامی قانون ان دونوں سے الگ اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ ایک مذہبی قانون ہونے کی حیثیت سے ہر مسلمان اس پر عمل کرنے کا پابند ہے۔ وہ اس پر اپنے ایمان اور عقیدے کا ایک حصہ سمجھتے ہوئے عمل کرتا ہے اور اس عمل در آمد کے لیے کسی بیرونی قوت کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اسلامی قانون کو ماننے والے ایک معاشرہ میں کسی پولیس یا عدالت سے بھی پہلے انسانوں کا ضمیر ان کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ رات کی تاریکیوں میں بھی قانون پر عمل در آمد کریں۔ وہاں یہ اعلان کافی ہے کہ آج سے اللہ تعالیٰ نے شراب حرام کر دی ہے اور لمحہ بھر کے اندر اندر شہر کی گلیوں میں بارش کے پانی کی طرح شراب بہتی نظر آتی ہے۔ وہاں یہ بتا دینا کافی ہوتا ہے کہ آج سے سود حرام کر دیا گیا ہے اور اگلے دن سے لوگ ایسے ہر کاروبار سے احتراز کرنے لگ جاتے ہیں جس میں سود کا شائبہ بھی پایا جاتا ہو۔ وہاں جرم کے ارتکاب کے بعد مجرم خود بار بار آکر ریاست سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس کو سزا دے کر پاک کر دیا جائے۔

یہ قانون کی وہ روح ہے جو انسان کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ قانون پر سچے دل سے عمل در آمد کا یہ جذبہ صادق اس کے رگ و پے میں سما جاتا ہے۔ اس پر جو چیز عمل در آمد کراتی ہے وہ تقویٰ اور خوف الٰہی کا جذبہ ہے۔ لیکن اس کو محض انسانوں کے مذہبی جذبہ پر نہیں چھوڑ دیا گیا ہے بلکہ

اس اندرونی قوت کی تکمیل بیرونی قوت سے کرنے کا سامان بھی کر دیا گیا ہے۔ ریاستی قوت اور عدالتی اداروں کے ذریعہ قانون شکنوں سے عہدہ برآ ہونے کا بندوبست بھی شریعت میں موجود ہے۔ اس طرح ریاست اور مذہب ایک دوسرے کے معاون و مددگار بن جاتے ہیں۔ نہ ریاست مذہب کی راہ نمائی سے مستغنی ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور نہ مذہب ریاست کے وسائل سے مستغنی ہو کر فراریت کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو سیدنا عثمان غنیؓ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا : الاسلام اس و السلطان حارس یعنی اسلام ایک بنیاد ہے (جس پر مسلمانوں کی زندگی کی عمارت استوار ہے) اور حکومت ایک نگہبان ہے۔ اگر کسی عمارت کی بنیاد نہ ہو تو وہ عمارت گر جاتی ہے اور اگر کسی عمارت کا نگہبان نہ ہو تو وہ ضائع ہو جاتی ہے' اس کو لوٹ لیا جاتا ہے' اس پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔

اسلام کی بقا اور مسلمانوں کی وحدت ملی کے تحفظ کے لیے دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ عصا نہ ہو تو کلیسی ہے کار بے بنیاد۔ یہ توازن اور دین و دنیا کا یہ حسین امتزاج ہی اسلام کا سب سے بڑا طرہ امتیاز ہے۔ بہت سے لوگوں کو اس امتزاج کو سمجھنے میں دقت ہوئی ہے۔ وہ اس کے ایک پہلو پر غور کرتے ہیں تو اس کو سیکولر نظام سے مشابہ پاتے ہیں' دوسرے پہلو پر نظر ڈالتے ہیں تو اسے ایک خالص روحانی اور مذہبی عقیدہ سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن اگر ان دونوں پہلوؤں پر نظر ہو تو پھر اسلام کا اعتدال و توازن سامنے آتا ہے جو انسانی مزاج اور طبیعت سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

چوتھی بات جو اسلامی قانون کی تاریخ کا معمولی مطالعہ رکھنے والا بھی جانتا ہے یہ کہ یہ قانون بنیادی طور پر ایک غیر سرکاری قانون ہے۔ یہ ایک ایسا قانون ہے جس کے بنانے' مرتب کرنے اور توسیع دینے میں کبھی کسی ریاست کی مداخلت نہیں ہوئی۔ اس قانون کی تکمیل میں' اس کے نفاذ میں' حتیٰ کہ اس کے لیجسلیٹ کرنے میں ریاست کا کبھی بھی براہ راست دخل نہیں رہا۔ یہ قانون خود بخود غیر سرکاری طور پر ایک خالص پرائیویٹ قانون سازی کے نتیجہ میں سامنے آیا ہے۔ بظاہر یہ بات بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ کوئی قانون ریاست سے بالا بالا محض پرائیویٹ قانون سازی کے نتیجہ میں تیار ہو جائے۔ لیکن اسلامی قانون کا مزاج یہی ہے کہ وہ اپنے روز آغاز سے لے کر اپنی پوری تاریخ کے دوران ریاست کی مداخلت اور بڑی حد تک سرکاری اثرات سے آزاد رہا ہے۔ آج بھی یہ ایک حد تک پرائیویٹ قانون ہے۔ اس کے متعدد شعبوں میں آج بھی پرائیویٹ طور پر عمل درآمد ہو رہا ہے اور غیر سرکاری اہل علم اجتہاد اور افتا کے ذریعے ضروری مسائل میں "قانون سازی" کر رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ سب کام کسی باقاعدہ قانون ساز ادارہ کے بغیر کیسے ہو رہا ہے اور کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا غیر سرکاری قانون سازی کا نتیجہ کسی افراتفری کی شکل میں نہیں نکلے گا؟ ان سوالات کا جواب

بڑی آسانی سے مل سکتا ہے اگر اسلامی قانون کی تاریخ اور اجتہاد و اجماع کے ارتقا کو پیش نظر رکھا جائے۔

جب سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے تو اسلامی قانون کی تمام بنیادیں فراہم ہو چکی تھیں، دین مکمل کیا جا چکا تھا اور نعمت تمام ہو چکی تھی۔ قرآن پاک کی صورت میں ہدایت الٰہی تحریری طور پر صحیفوں میں اور زبانی طور پر ہزاروں نفوس قدسیہ کے سینوں میں موجود تھی۔ سنت رسولؐ کی صورت میں کتاب الٰہی کی عملی تعبیر و تشریح انسانوں کے سامنے پیش کر دی گئی تھی۔ قرآن و سنت کی اقدار و مقاصد کی علمبردار اور شریعت کے احکام کی خارجی تشکیل یعنی جماعت صحابہ کی اجتماعی زندگی کی شکل میں اس پر اجتماعی اور ریاستی عمل درآمد کی مثال فراہم کر دی گئی تھی۔ یہ وہ بنیادیں تھیں جن پر آیندہ اسلامی قانون کی وسیع و عریض اور بے مثال عمارت کو استوار ہونا تھا۔

اب قانون سازی اور توسیع قانون کی صورت یہ ہوئی کہ جب کوئی نیا مسئلہ پیش آیا جس میں نئی "قانون سازی" یا نئی راہ نمائی کی ضرورت پیش آئی، تو یہ قانون سازی یا نئی راہ نمائی کسی سرکاری یا ریاستی پلیٹ فارم کے بجائے اصحاب علم و تقویٰ مجتہدین کی طرف سے پیش کی گئی۔ فقہائے مجتہدین نے ہر پیش آمدہ مسئلے پر غور کیا اور اپنی انتہائی فہم و بصیرت کے بموجب اس کا شرعی اور اسلامی حل دریافت کرنے کی مقدور بھر سعی کی اور جو حل دلائل کی روشنی میں سمجھ میں آیا وہ امت کے سامنے پیش کر دیا۔ اس سارے عمل میں ان کا اولین و آخرین محرک خوف خدا اور آخرت کی جواب دہی کا احساس تھا۔ قرآن پاک نے اصحاب علم کی یہ ذمہ داری قرار دی ہے کہ وہ علم کو چھپانے سے اجتناب کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرورت کے موقعہ پر علم کو چھپانے اور مطلوبہ راہ نمائی فراہم نہ کرنے والے عالم کو گونگا شیطان قرار دیا ہے۔

ان احکام کی رو سے ہر صاحب علم شخص پابند ہے کہ جب بھی ضرورت پیدا ہو وہ اپنا علم امت کے سامنے پیش کرے اور قرآن و سنت کے دلائل کی روشنی میں اپنا دریافت کردہ حل سامنے لائے۔ اس طرح بہت سے حل اور تجاویز سامنے آئیں گی۔ اور دوسرے فقہا اس پر تبصرہ کریں گے، یوں دلائل اور جوابی دلائل کی بنیاد پر ایک قومی اور ملی مباحثہ ہو گا اور یا تو تمام فقہا کسی ایک رائے پر متفق ہو کر اس رائے کو اختیار کر لیں گے یا دو تین آرا اختیار کر لی جائیں گی اور امت جس فقیہ کے دلائل، علم اور تقویٰ سے متاثر ہو گی اس کی رائے پر عمل کرنے لگے گی اور اس طرح وہ قانون ملکی کا جزبن جائے گی، عدالتیں اس کے مطابق فیصلے صادر کرنے لگیں گی اور اصحاب افتا اس کے بموجب فتوے دینے لگیں گے۔

"قانون سازی" کا یہی طریقہ صدر اسلام میں شروع ہوا اور کم و بیش تیرہ سو سال تک جاری

رہا۔ اس پورے دور میں کبھی بھی حکومت وقت یا حکمرانوں کو اس عمل پر اثر انداز ہونے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حکمرانوں اور حکومتوں نے "قانون سازی" کے اس عمل پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کی' بلاشبہ مختلف حکمرانوں نے مختلف مقاصد و محرکات ـــــ مثبت اور منفی دونوں ـــــ کے تحت "قانون سازی" کے اس کام کو اپنے ڈھب کے مطابق ڈھالنے کی کوششیں کیں لیکن ایسی قریب قریب تمام ہی کوششیں ناکام رہیں۔ حکمرانوں یا کسی بھی بااثر طبقہ یا فرد کے مفاد کی خاطر دیے جانے والے کسی فتویٰ کو کبھی بھی امت نے قبول نہیں کیا اور نہ ایسا فتویٰ کبھی شریعت کی معتبر و مستند تعبیر مانا گیا۔ امت کے اجتماعی ضمیر اور اسلامی خمیر نے وہی بات قبول کی جو قرآن و سنت کے احکام سے ہم آہنگ تھی اور اس بات کا کہنے والا علم اور تقویٰ کی میزان میں کھرا قرار پایا تھا۔

یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ جن مجتہدین کے اجتہادات اور جن مفتیوں کے فتوے امت میں مستند اور معتبر ٹھہرے اور جن کی "قانون سازی" کو عدالتوں کے ججوں سے لے کر عامتہ الناس نے قبول عام سے نوازا' وہ سب کے سب نہ صرف پرائیویٹ شہری تھے اور کوئی سرکاری منصب نہیں رکھتے تھے بلکہ بعض صورتوں میں وہ اپنے اپنے معاصر حکمرانوں کی نظر میں ناپسندیدہ شخصیت بھی تھے۔ امام ابو حنیفہ جن کو دنیا کی تاریخ کے چند عظیم ترین قانونی دماغوں میں شمار کیا جاتا ہے اور جن کی تعبیر قانون کو دنیائے اسلام کا دو تہائی کے قریب حصہ تسلیم کرتا آیا ہے' کسی پارلیمنٹ کے رکن نہیں تھے۔ امام احمد بن حنبل جن کے فقہی اقوال آج سعودی عرب میں قانون کی حیثیت سے نافذ ہیں' ان کو کسی حاکم نے قانون سازی کے کام پر مامور نہیں کیا تھا۔ امام جعفر صادق کسی لاکمیشن کے رکن نہیں تھے۔ یہ اور ان جیسے سیکڑوں مجتہدین امت' ریاست کے عام شہری تھے لیکن ان کے اقوال اور تعبیرات قانون کو ان کے ہم عصر حکمرانوں اور قاضیوں نے اسی بنیاد پر تسلیم کر کے نافذ کیا جس بنیاد پر آج دنیا کے سوا ارب مسلمان ان کے فقہی اقوال اور تعبیرات قانون پر عمل پیرا ہیں۔

ان حضرات نے نہ صرف قانون کے میدان میں نئے نئے پیش آمدہ مسائل پر غور کر کے ان کا اسلامی حل تجویز کیا بلکہ ہزاروں لاکھوں مسائل کے پیش آنے سے پہلے ہی ان کا پیشگی اندازہ کر کے ان کا بھی حل تجویز کر دیا۔ ان کی فکر واقعات اور تاریخ کے ساتھ نہیں' واقعات اور تاریخ سے بہت آگے تھی۔ انھوں نے ان تمام آرا اور تجاویز کی تائید میں مکمل عقلی اور نقلی دلائل پیش کیے۔ ان میں جس جس کے علم اور تقویٰ پر جس جس کو جتنا اعتماد تھا' وہ اس حد تک ان کے اقوال کو شریعت کی جائز اور مستند تعبیر تسلیم کر کے قبول کرتا گیا۔ اگر وہ حکمران تھا تو اس نے اس کے مطابق حکمرانی کی۔ اگر وہ قاضی تھا تو اس نے ان اقوال کے مطابق مقدمات فیصل کیے' اگر وہ عام آدمی تھا تو اس نے اپنی روز مرہ زندگی میں ان پر عمل درآمد کیا۔ اگر وہ قانون کا استاذ تھا تو اس نے تدریس قانون میں ان اقوال و

اجتہادات کو بنیاد بنایا۔

اسلام کی تاریخ کے ابتدائی بارہ سو سال میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی حکمران نے حکمرانی کے زور پر کوئی قانون بنا کر نافذ کر دیا ہو اور اس کو امت نے قبول بھی کر لیا ہو، یا کسی حکمران نے باہر سے کوئی قانون درآمد کر لیا ہو۔ قانون کے معاملہ میں مسلمان خود کو اتنا خود کفیل بلکہ اعلیٰ اور برتر سمجھتے تھے کہ انھوں نے محض علمی دلچسپی کی خاطر بھی قانون کی کسی کتاب کا کسی دوسری زبان سے عربی میں ترجمہ نہیں کیا۔ دوسری صدی ہجری سے لے کر آیندہ کئی سو سال کے عرصہ میں فلسفہ، عقلیات، منطق، طب، ادب وغیرہ کی ہزارہا کتابیں سنسکرت، یونانی، فارسی، آرامی اور دوسری زبانوں سے عربی میں ترجمہ کی گئیں لیکن قانون یا دستور کی کسی کتاب کا ترجمہ کرنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ سوائے اس کے نہیں کہ قانون مسلمانوں کے ضمیر اور خمیر کا ایک جزو تھا۔ وہ معاشرہ یا ریاست کی تخلیق نہیں تھا بلکہ ریاست اور معاشرہ قانون کی تخلیق تھے۔

دنیا میں ریاست پہلے وجود میں آتی ہے، قانون بعد میں وجود میں آتا ہے۔ اسلام میں قانون پہلے وجود میں آیا اور ریاست بعد میں اس لیے وجود میں آئی کہ اس قانون کو نافذ کرے اور اس کی حفاظت کرے، اسلامی ریاست کا قانونی جواز (legitimacy) ہی اس وقت تک ہے جب تک وہ اس قانون کو نافذ کرتی ہے۔ بصورت دیگر ریاست اپنا قانونی جواز اور مقصد وجود کھو بیٹھتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں تشریف آوری سے قبل، قیام ریاست سے بہت پہلے، قانون کے مبادی اور اساسی تصورات بیان فرما دیے تھے۔ آیندہ، ریاست کے ''مابعد اصول قانون'' یعنی metajurisprudence کے اصول عطا فرمائے تھے۔ انھی اصولوں اور تصورات کی حفاظت کے لیے قانون دیا جانا تھا۔ اور اسی قانون کے نفاذ اور تحفظ کے لیے ریاست کے قیام کی ضرورت پیش آئی تھی۔

آج مسلمانوں کا المیہ یہی ہے کہ ان کی قومی ریاستیں موجود ہیں لیکن ان کے حکمرانوں نے اسلامی قوانین نافذ نہیں کیے۔ آج مسلمانوں کے دلوں میں جو طوفان بپا ہے وہ اسی تڑپ کا ایک مظہر ہے جو وہ اسلامی قانون کے لیے رکھتے ہیں۔ آج دنیائے اسلام میں جو اضطراب پایا جاتا ہے اس کا اصل سبب یہی ہے کہ مسلمانوں کی قومی ریاستیں ریاست کے مقصد وجود پر عمل پیرا نہیں ہیں۔ آج کا مسلمان کسی مبہم تصور کے پیچھے سرگرداں نہیں ہے۔ وہ کسی غیر طے شدہ قانون کا مطالبہ نہیں کرتا، وہ کسی موہوم ہدف کی تلاش میں پریشان نہیں ہے۔ اس کا ہدف واضح، اس کی منزل متعین اور اس کا تصور ایک طے شدہ اور دوٹوک نظریہ سے عبارت ہے۔ وہ جس راستہ کا مسافر ہے وہ اتنا روشن اور صاف ہے کہ وہاں رات کو بھی دن کا سماں رہتا ہے (لیلھا کنھارھا)۔

آج مغرب نے قانون سازی کی یہ آزادی سلب کر لی ہے۔ اس نے عامۃ الناس اور آزاد

باکردار اہل علم و دانش کا یہ فریضہ ہتھیا کر ایک مفاد پرست طبقہ کے ہاتھ میں دے دیا ہے جو اس کو طبقاتی مفادات کی تکمیل کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ دنیائے اسلام میں آج جو کشمکش برپا ہے وہ دراصل قانون کو غصب کر لینے والوں اور قانون کی آزادی اور اسی طرح مساوات کا مطالبہ کرنے والوں کے درمیان آویزش کا دوسرا نام ہے۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی بارہ سو سال کے دوران قانون سازی کا یہ کام کسی نام نہاد ادارہ کی اجارہ داری نہیں رہا۔ بلکہ یہ کام ایک ایسے قومی اور عوامی عمل کے ذریعہ ہوتا رہا جس میں عامتہ الناس نے براہ راست حصہ لیا اور اپنے اجتماعی عمل اور اجتماعی فیصلہ سے فقہا کے اجتہادات کو قانون کی شکل دے دی۔ اس عمل میں وہ تمام مثبت پہلو موجود تھے جو افلاطون کے دور سے آج تک مختلف نظریات ساز فلاسفہ اور حکما حکومت کے بارے میں بیان کرتے آئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عامتہ الناس کی براہ راست قانون سازی اور کامل مساوات کی ضمانت بھی اس عمل کے ذریعہ حاصل رہی۔

اسلامی تاریخ میں شوریٰ بھی رہی، اہل اختیار کے ادارے بھی رہے لیکن ان میں سے کسی کو بھی قانون سازی کا کوئی inherent اختیار کبھی بھی حاصل نہیں ہوا۔ ان اداروں کو دور جدید کی پارلیمنٹ کا پیش رو قرار دینا بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اسلامی تاریخ میں مغرب کے اثرات سے پہلے کبھی بھی قانون سازی کے لیے کوئی سرکاری یا فارمل ادارہ وجود میں نہیں آیا۔ مسلمانوں کے مزاج نے ایسے اداروں کے قیام کو آزادی قانون کی روح کے خلاف سمجھا۔ امام مالک نے اسی لیے عباسی خلفا کی اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا تھا کہ ان کی موطا کو ملکی قانون کا درجہ دے دیا جائے۔ امام مالک نے اپنی ذاتی شہرت اور دنیاوی کریڈٹ کو یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس سے فقہا کی وہ آزادی محدود ہو جائے گی جو اسلام نے ان کو دی ہے۔

ممکن ہے آج بعض حضرات کو یہ سمجھنے میں دقت ہو کہ ریاست کے ٹھپے کے بغیر قانون کیسے بن اور چل سکتا ہے۔ اس دقت کی ایک وجہ تو وہ تصورات اور رواجات ہیں جو آج مغربی روایات کے اثر سے ہمارے ہاں عام ہو گئے ہیں جن کی رو سے قانون وہی ہے جو کسی فرماں روا یا بالاتر حکمران نے جاری کیا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کے اس خصوصی مزاج پر غور نہیں کیا گیا۔ ذرا توجہ سے دیکھا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ آج بھی دنیائے اسلام میں اسلامی قانون کے ایک بڑے حصہ پر کسی سرکاری مداخلت اور ریاستی اثر و رسوخ کے بغیر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ ابھی میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلامی قانون کا ایک بڑا حصہ عبادات، مناکحات، معاملات اور الحظر و الاباحتہ کے اہم موضوعات پر مشتمل ہے۔ دنیا کا ہر مسلمان ان امور سے متعلق بہت سے اسلامی احکام پر عمل کرتا ہے اور ان احکام کو واجب التعمیل سمجھتا ہے۔ ان امور سے متعلق نئے نئے فتاویٰ بھی آتے رہتے ہیں، نئے نئے پیش آمدہ مسئلہ کے بارے میں نئی "قانون سازی" بھی ہوتی رہتی ہے اور اس کا طریقہ کار وہی ہے جو اوپر بیان

کیا گیا کہ پرائیویٹ ماہرین مجوزہ حل قوم کے سامنے دلائل سے پیش کرتے ہیں اور جس ماہر کے علم اور تقویٰ پر قوم کے جس حصہ کو اعتماد ہوتا ہے وہ حصہ اس حل کو قبول کر کے اس پر عمل کرنا شروع کر دیتا ہے اور جب ایسا کوئی معاملہ عدالت میں پیش آتا ہے تو عدالت کے روبرو ایسے تمام ماہرین کی آرا اور ان کے تجویز کردہ حل مع دلائل دیے جاتے ہیں۔ پھر جس رائے سے عدالت مطمئن ہو اس کی بنیاد پر وہ معاملہ کا فیصلہ کر دیتی ہے۔

آج حکومت کی طرف سے کوئی قانون ادائگی نماز یا قانون تکمیل روزہ، قانون ادائگی فریضہ حج، قانون لباس، معاشرت لکٹ یا خوراک آرڈیننس موجود نہیں ہے۔ بلاشبہ ان موضوعات کے بارے میں اسلام کا قانون موجود ہے جس میں اضافہ اور توسیع بھی ہوتی ہے اور نئے نئے قوانین بھی بنتے رہتے ہیں۔ پرانے قوانین پر نظر ثانی کا عمل بھی جاری رہتا ہے اور عامتہ الناس ان قوانین پر دنیا بھر میں عمل درآمد بھی کرتے رہتے ہیں لیکن اس سارے عمل میں کسی حکومت، حکمران، ریاستی ادارہ یا کسی اسمبلی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ایک مسلمان اپنے دین و ایمان کے مطابق جس کام کو حلال سمجھتا ہے، اس کو اختیار کرتا ہے اور جس چیز کو حرام سمجھتا ہے اس سے اجتناب کرتا ہے۔ جہاں شبہ ہوتا ہے وہاں کسی صاحب علم و تقویٰ سے جاکر پوچھ لیتا ہے اور دستیاب اصحاب علم و تقویٰ میں سے جس کے علم و تقویٰ پر اس کو اعتماد ہو، اس کی بات پر عمل کرتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں اس کی درجنوں مثالیں موجود ہیں کہ کسی معاملہ میں حکومتوں اور فرماں رواؤں نے ایک رائے اختیار کی اور اصحاب علم و تقویٰ نے اس کے خلاف رائے دی۔ عوام نے حکومتوں اور فرماں رواؤں کی رائے کو مسترد کر دیا اور اصحاب علم و تقویٰ کی رائے کو اختیار کر لیا۔ بعض لوگ اسلامی قانون کو عرب ملوکیت سے متاثر بتاتے ہیں جو سراسر ناواقفیت کی دلیل اور واقعات کے قطعی طور پر منافی ہے۔ ممکن ہے کسی ایک آدھ جزوی معاملہ میں کسی فقیہ نے کسی حکمران کی رعایت سے اپنے فتویٰ میں نرمی کر دی ہو، لیکن ایسے فتاویٰ کو کبھی بھی رواج اور قبول عام حاصل نہیں ہو سکا۔ سرکاری اثرات سے آزادی، اقتدار و حکومت کے مقابلہ میں مکمل خود مختاری اور ریاستی بالادستی سے انکار فقہ اسلامی کی سب سے نمایاں امتیازی خصوصیت ہے۔ اس خصوصیت میں دنیا کا کوئی ترقی یافتہ قانون فقہ اسلامی کا شریک و سہیم نہیں۔

یہ فقہ اسلامی کا ایک نہایت سرسری اور عمومی تعارف ہے اور یہ چند بنیادی خصوصیات ہیں جو فقہ اسلامی کو دنیا کے دوسرے متمدن اور ترقی یافتہ قوانین سے ممتاز کرتی ہیں۔

و اخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین


بہترین ذائقے کی عظیم الشّان روایت
رُوح افزا
مشروبِ مشرق
مفرح پھلوں، مؤثر جڑی بوٹیوں، صحت بخش سبزیوں
اور شاداب پھولوں سے تیار کیا جانے والا
حکمت و مہارت کا شاہ کار، رُوح افزا، جسم و جاں کو گرمی کی
شدّت سے محفوظ رکھتا ہے، تازگی اور توانائی بخشتا ہے۔
مخصوص و منفرد ذائقے اور بے مثال خواص کی
وجہ سے خوش ذوق شائقین کی اوّلین پسند رُوح افزا
- اس صدی کا سب سے بہتر مشروب
رُوحِ ثقافت
رُوح افزا
ہمدرد
SHARBAT
ROOH AFZA
مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ
آپ ہمدرد دوست ہیں۔ اعتماد کے ساتھ مصنوعات ہمدرد خریدتے ہیں۔ جائز منافع بین الاقوامی
شہرِ علم و حکمت کی تعمیر میں لگ رہا ہے۔ اس کی تعمیر میں آپ بھی شریک ہیں۔

51

۹۷-۱۹۹۶ کا بجٹ --- چند قابلِ غور پہلو

پروفیسر خورشید احمد

بے نظیر بھٹو نے اپنا تیسرا بجٹ اسمبلی میں پیش کر دیا ہے' اور ازراہ تفنن اسے "غریب آدمی کا بجٹ" (poor man's budget) قرار دیا ہے۔ حالانکہ پاکستان کی تاریخ میں اس سے زیادہ "غریب کش" بجٹ پیش نہیں ہوا۔ انھوں نے' اور ان کے وزیر مملکت برائے خزانہ نے پچھلے دو بجٹوں کی طرح اس دفعہ بھی ماضی کی حکومتوں پر بھرپور تبرا کیا ہے' اور سابق وزیراعظم کے "ترکہ" کا اس طرح نوحہ کیا ہے جیسے وہ اس سال برسراقتدار آئی ہوں' حالانکہ اب ان کو اقتدار میں آئے پونے تین سال ہونے کو آرہے ہیں۔ اگر کسی کے "ترکہ" نے معیشت کا حال تباہ کر رکھا ہے تو وہ خود ان کے سہ سالہ اقتدار کی غلط پالیسیوں' بدانتظامیوں اور شاہ خرچیوں کا ترکہ ہے جس کا انھیں کسی دوسرے کو دوش دینے کے بجائے اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے۔

۵۰۰ بلین روپے کے اس بجٹ میں ۲۲۰ بلین کا خسارہ ہے جسے بڑی عاقبت نا شناسی سے پورا کیا جا رہا ہے یعنی ۱۰۳ بلین بیرونی قرضوں کے ذریعہ' ۵۰ بلین کے قریب سرمایہ پر مبنی آمدنی اور نج کاری کی آمدنی کے ذریعے' ۲۰ بلین خسارہ کی سرمایہ کاری کے ذریعے اور ۴۱ بلین نئے ٹیکس لگا کر۔ بجٹ کا یہ فریم ورک من و عن وہی ہے جس پر گذشتہ ۲۵ سال سے بجٹ سازی ہو رہی ہے' اور جس کا نتیجہ ہے کہ آج سود اور قرضہ کی ادائگی میں قرض / آمدنی کا ۴۰ فیصدی صرف ہو رہا ہے اور قرضوں کا بوجھ بڑھتا جا رہا ہے۔ حقیقی ترقیاتی اخراجات کا تناسب برابر کم ہو رہا ہے اور نظام معیشت میں کوئی ایسی تبدیلی رونما نہیں ہو رہی ہے جو ملک کے غریب عوام کی قسمت کو بدلنے کا ذریعہ بنے۔ ہم روز بروز غربت' بیرونی ممالک کی محتاجی' خود کفالت سے دوری' اور عالمی منڈیوں میں مسابقت کے قابل نہ رہنے کی دلدل میں پھنستے چلے جا رہے ہیں۔ اس خطرناک روش پر چلنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند سال میں ملک تقریباً دیوالیہ ہو جائے اور بجٹ آمدنی کا بڑا حصہ صرف قرض ادا کرنے کی نذر ہو جائے۔

سال رواں (۱۹۹۵-۹۶) میں معیشت کی رفتار ترقی میں بظاہر اضافہ ہوا ہے اور قومی پیداوار میں ۶.۱ فی صد کا اضافہ جتایا گیا ہے۔ لیکن اس کی بڑی وجہ زراعت میں ۷ فی صد کی ترقی ہے جو دراصل کپاس کی اچھی فصل (۱۰ ملین گانٹھ) اور گندم کی وافر پیداوار (۱۹ بلین ٹن) کی رہین منت ہے۔ جہاں تک صنعتی پیداوار کا تعلق ہے بڑی صنعتوں کی پیداوار میں صرف ۳ فی صد اضافہ ہوا ہے' برآمدات میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکا' اور تجارت میں خسارہ مزید بڑھ گیا ہے۔ درآمدات ۵.۱۱ بلین ڈالر رہی ہیں جب کہ برآمدات متوقع ۱۰ بلین ڈالر کے مقابلے میں صرف ۸ بلین ڈالر۔ اس طرح پاکستان کو تاریخ کے سب سے بڑے تجارتی خسارے' یعنی ۵.۳ بلین ڈالر کا سامنا ہے' جو تباہ کن ہے' اور جس کے اثرات مبادلہ خارجہ کے ذخائر پر بھی سخت منفی ہیں۔ قرضوں کا بوجھ اس کے علاوہ ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق بیرونی قرضوں کا بوجھ اب ۵۶ بلین ڈالر سے متجاوز ہے۔ ملکی قرضے بھی ۷۰۰ بلین روپے ہیں' (ہفت روزہ Politics and Business' ۱۱ جون ۹۶' ص ۱۲)۔ اس کے ساتھ افراط زر کا مسئلہ ہے جس نے عام آدمی کی کمر توڑ دی ہے۔ بجٹ میں ۱۰ فی صد افراط زر کا دعویٰ کیا گیا ہے جب کہ حقیقی افراط زر ۲۰ فی صد سے کسی طرح کم نہیں ہے اور نئے بالواسطہ ٹیکسوں سے اس میں مزید اضافہ ہو گا۔

بجٹ کا سب سے مایوس کن پہلو یہ ہے کہ قرضوں کے بوجھ سے نجات پانے کی کوئی اسٹرے ٹیجی وضع نہیں کی گئی ہے بلکہ جو آمدنی سرمایہ کاری اور نج کاری سے حاصل ہو رہی ہے وہ بھی قرضوں کا بوجھ اتارنے کے بجائے جاری بجٹ کو پورا کرنے کے لیے استعمال کی جا رہی ہے۔ یہ قدم اثاثوں کا ایسا غلط استعمال ہے جسے بجا طور پر غداری کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے۔ خود انحصاری کمیشن کی رپورٹ نے نج کاری کی آمدنی کو صرف قرضوں کی واپسی کے لیے مختص کرنے کی سفارش کی تھی۔ یہی مطالبہ سینیٹ کی فنانس کمیٹی نے اپنی دو رپورٹوں میں کیا ہے۔ حکومت کے نمایندوں نے اس پر عمل درآمد کی یقین دہانی بھی کروائی تھی مگر عملاً اس طرف کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی ہے۔

ملک میں جس انداز میں آزاد معیشت اور آزاد تجارت کو رواج دینے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ صریح تباہی کا راستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ درآمدات بڑھ رہی ہیں' برآمدات uncompetitive ہونے کی وجہ سے بڑھ نہیں پا رہیں۔ صنعتیں بند پڑی ہیں اور پیداواری صلاحیت (capacity) سے ۴۰ فی صد کم پر کام کر رہی ہیں۔ بے روزگاری بڑھ رہی ہے جس بیرونی سرمایہ کاری کی خوش خبریاں سنائی جا رہی ہیں' اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ معاشی بنیادی ڈھانچہ (infrastructure) ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور بد سے بدتر ہو رہا ہے۔ افراط زر بڑھ رہا ہے اور حکومت اور اس کے حواری ہیں کہ چین کی بنسری بجا رہے ہیں۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ملک کا بنکاری نظام شدید بحران سے دوچار ہے۔ ۴۰ فی صد قرضے غیر متحرک ہیں۔ ۱۷ سے ۲۴ فی صد شرح سود (mark up) پر بھی بنک مشکلات سے دوچار ہیں۔ بنک کے قرضوں کا ۹۴ فی صد حکومت اور اس کے ادارے لے رہے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں پرائیویٹ سرمایہ کاری مشکلات سے دوچار ہے اور بنک سرمایہ کاری کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ ٹیکس چوری، رشوت اور بدعنوانی کا یہ حال ہے کہ ملکی وسائل کا کم از کم ۳۰ سے ۴۰ فی صد ان کی نذر ہو رہا ہے۔ رشوت اور چوری کی قیمت کا محتاط اندازہ تقریباً ۲۰۰ ارب روپے سالانہ ہے۔

ایک طرف ملک کی معیشت کی یہ حالت ہے اور دوسری طرف حکمرانوں کا یہ حال ہے کہ بڑے زمینداروں پر ابھی کوئی ٹیکس نہیں لگایا گیا اور حکومت کے کارپردازوں کی دلچسپی صرف اپنی ذاتی مراعات کے حصول اور قوم کو لوٹنے میں نظر آتی ہے جس کی بدترین مثال خود صدر اور وزیراعظم کو دی جانے والی مراعات اور ان پر خرچ کی جانے والی رقوم ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت قائداعظم محمد علی جناح اور پورے ایوان صدارت پر صرف ۲۰ ہزار روپے سالانہ خرچ ہوتا تھا جبکہ سال رواں میں صرف ایوان صدر پر ایک ارب روپے اور وزیراعظم کے ایوان پر ۸۰۰ ملین روپے خرچ ہوئے ہیں۔ گویا صرف سربراہان مملکت اور حکومت پر تقریباً دو بلین روپے سالانہ خرچ ہو رہے ہیں۔ اگر اس کا مقابلہ اس رقم سے کیا جائے جو مرکزی بجٹ سے پورے ملک کے تین کروڑ نوجوانوں کی تعلیم پر خرچ ہو رہے ہیں تو یہ افسوس ناک حقیقت سامنے آتی ہے کہ پورا فیڈرل تعلیمی بجٹ صرف ۴.۸۷ بلین روپے ہے جبکہ ان دو سرکاری گھرانوں پر پورے تعلیمی بجٹ کا ۴۶.۵ فی صدی خرچ ہو رہا ہے۔ بالفاظ دیگر پورے تعلیمی بجٹ میں تقریباً ۵۰ فی صدی اضافہ ہو سکتا ہے اگر یہ دو سفید ہاتھی قابو میں لائے جا سکیں۔ اگر ان اخراجات کا موازنہ ملک کے فیڈرل بجٹ برائے صحت سے کیا جائے تو اور بھی ہولناک صورت حال سامنے آتی ہے۔ قوم کی صحت پر کل سالانہ خرچہ ۱.۴۸۳ بلین روپے ہے یعنی ان دو سفید ہاتھیوں پر ملک کے صحت کے پورے بجٹ سے بھی ۳۰ فی صد زیادہ خرچ کیا جا رہا ہے اور اس پر دعوے ہیں غریب نوازی کے، اور وزیراعظم صاحبہ اسے غریب آدمی کا بجٹ کہہ رہی ہیں۔

ملک میں بجٹ سازی کا ایک اور بڑا ہی پریشان کن پہلو ہماری معیشت اور ہماری سیاست پر آئی ایم ایف (IMF) کی بالادستی ہے۔ بجٹ میں ملک کی معیشت کو صحیح خطوط پر استوار کرنے سے کہیں زیادہ دلچسپی اس امر سے لی گئی ہے کہ آئی ایم ایف کو کیسے مطمئن کیا جائے۔ اس کی سب سے اندوہ ناک مثال حکومت کے معاشی مشیر وی اے جعفری کا وہ مشورہ ہے جو انھوں نے کراچی میں ملک کی تاجر اور صنعت کار برادری کو دیا۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ برآمد کی جانے والی اشیا کو جنرل سیلز ٹیکس سے مستثنیٰ کرنا ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ گو تاجر برادری کے دلائل میں بڑا وزن ہے لیکن حکومت

مجبور ہے۔ اس لیے انھوں نے مشورہ دیا کہ تاجروں کا ایک وفد آئی ایم ایف کے ذمہ داروں سے ملے اور ان کو مطمئن کرے۔ اگر وہ مطمئن ہو گئے تو پالیسی میں تبدیلی ممکن ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اس سے زیادہ کسی قوم کی ذلت اور کیا ہو گی اور اس سے زیادہ ان کی آزادی اور خود مختاری کو کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ حکومت کا معاشی مشیر تاجروں کو مشورہ دے کہ اپنی حکومت کے بجائے بلاواسطہ آئی ایم ایف سے بات کریں! سوال یہ ہے کہ پھر حکومت کی ضرورت کیا ہے۔ کیوں نہ ملک کی معاشی پالیسی کا ٹھیکہ چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کو دے دیا جائے۔ کم از کم آئی ایم ایف کو باگ ڈور دینے سے تو بہتر ہو گا کہ اپنے تاجروں کو یہ کام سونپا جائے۔

اس صورت حال کے اس کے سوا اور کیا معنی ہیں کہ اس بدقسمت ملک کے ارباب اقتدار نے واشنگٹن کی بالادستی کو قبول کر لیا ہے اور حال یہ ہے کہ

انھی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں، زبان میری ہے بات ان کی
انھی کی محفل سنوارتا ہوں، چراغ میرا ہے رات ان کی

ان حالات میں یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ اس بجٹ کو ایک اسلامی ملک کا بجٹ سمجھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظریاتی اعتبار سے بجٹ کا کوئی ایسا پہلو ہمارے سامنے نہیں آ سکا جس سے دور و نزدیک یہ اندازہ ہو سکے کہ یہ ایک اسلامی فلاحی ملک کا بجٹ ہے اور اس کا تعلق اس قوم سے ہے جو اعلائے کلمتہ اللہ کے لیے برپا کی گئی ہے، جو انصاف کے قیام کی ذمہ دار ہے، جو غربت، افلاس اور مجبوری کو ختم کرنے کی داعی ہے اور جس کا اصل امتیاز ہی یہ تھا کہ اس کی قلم رو میں نہ کوئی بھوکا ہوتا تھا اور نہ بے سہارا، جس میں زکوٰۃ دینے والے تو ہوتے ہیں، مگر زکوٰۃ لینے والا نہ پائے جاتے ہوں۔ اور جو اپنے وسائل کو حق کی دعوت، معروف کے حکم اور منکر کو مٹانے کے لیے استعمال کرنے پر مامور ہے۔ ایک طرف امت مسلمہ پاکستان کے نظریاتی اور ملی اہداف ہیں اور دوسری طرف ارباب اختیار کی غفلت، بے وفائی اور بدانتظامی، اور یہ بجٹ اس زبوں حالی کا آئینہ دار ہے ؎

آئین چمن بندی بھی نہیں، دستور نوا سنجی بھی نہیں
اب اس سے زیادہ گلشن کا شیرازہ پریشان کیا ہو گا

خطوط مودودی" دوم پر پروفیسر خورشید احمد کے تبصرے کی تیسری اور آخری قسط آیندہ کسی شمارے میں پیش کی جائے گی۔

حماس - فلسطینی تحریک مزاحمت

ضیا اللہ رحمانی

مشرق وسطی میں 'قیام امن' کے نام نہاد منصوبہ میں یا سر عرفات اور اسرائیل کے اشتراک عمل کے بعد' اب فلسطین کی آزادی کی تحریک' الحرکۃ المقاومہ الاسلامیہ یعنی اسلامی تحریک مزاحمت (حماس) کو اسرائیل کے ساتھ ساتھ یا سر عرفات کی پولیس کا مقابلہ بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ اسرائیل کو فلسطین کی جذبہ اسلامی سے سرشار اس جہادی تحریک کو کچلنے کی کوششوں میں اب یا سر عرفات اور اس کے حامیوں کا تعاون بھی' حاصل ہو گیا ہے۔ اسرائیلی حکمراں خود بھی ہر طرح کے ظلم و ستم کر رہے ہیں اور یا سر عرفات کی خود مختار اتھارٹی سے بھی اقدامات کروا رہے ہیں۔ دوسری طرف ایک کے بعد ایک عرب ملک اسرائیل سے تجارتی اور سفارتی تعلقات قائم کر رہا ہے۔ ان حالات میں حماس (لغوی معنی 'جذبہ 'بہادری) اپنی تاریخ کے ایک نازک دور سے گزر رہی ہے۔

تاریخی پس منظر

حماس عظیم اسلامی تحریک اخوان المسلمون کا تسلسل ہے۔ ۱۹۳۵ میں جب امام حسن البنا شہید نے اپنے بھائی عبدالرحمن البنا کو تحریک کی دعوت پہنچانے کے لیے فلسطین بھیجا تو اس کی ابتدا ہوئی۔ ۱۹۴۵ میں اخوان نے بیت المقدس میں پہلا دفتر قائم کیا۔ ۱۹۴۷ میں ۲۵ دفاتر قائم ہو گئے تھے اور ۱۲ سے ۲۰ ہزار تک تحریک کے ارکان بن چکے تھے۔ معروف فلسطینی راہنما الحاج الامین الحسینی اس کے مقامی امیر تھے۔ فلسطین کے اخوان 'تحریک کے بانی حسن البنا کے علاوہ جن دو شخصیات سے جذبہ عمل حاصل کرتے تھے' ان میں سے ایک سید قطب شہید اور دوسرے عزالدین القسام شہید تھے جنھوں نے ۱۹۱۷ میں برطانیہ کے خلاف عملی جہاد کا آغاز کیا تھا۔

اسرائیل کے قیام کے بعد' مغربی کنارے کے علاقے میں اخوان کے تعلقات اردن کے حکمران ہاشمی خاندان سے اچھے تھے' جس نے ۱۹۵۰ میں مغربی کنارے کو اپنی مملکت کی حدود میں شامل کیا تھا۔

یہاں اخوان کی سرگرمیاں سماجی' اصلاحی اور مذہبی نوعیت کی تھیں۔ دوسری جانب غزہ کی پٹی میں' جو مصر کے زیر انتظام تھا' اخوان کی تنظیم کو ممنوع قرار دیا گیا تھا اور ان کے تعلقات حکومت سے کشیدہ تھے۔

۱۹۶۷ میں اسرائیل نے غزہ کی پٹی اور مغربی کنارے پر قبضہ کر لیا۔ اخوان نے اپنے ہدف' یعنی ایک اسلامی معاشرے کی تعمیر نو کے لیے رفاہی ادارے' مدارس اور ادبی و جسمانی سرگرمیوں کے لیے کلب وغیرہ کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ۱۹۷۳ میں' غزہ میں شیخ احمد یاسین کی قیادت میں ایک اسلامی مرکز کا قیام عمل میں لایا گیا۔ کچھ ہی عرصے کے اندر' یہ مرکز' اسلامی یونی ورسٹی غزہ سمیت' اخوان کے زیر اثر تمام اداروں کو کنٹرول کرنے لگا۔

۷۰ کے عشرے کے اواخر میں فلسطینی تحریک مزاحمت کی کمزوری اور ایران کے اسلامی انقلاب کے اثرات کی وجہ سے فلسطین کے لوگ تنظیم آزادی فلسطین کے کسی سیاسی اور نظریاتی متبادل کی تلاش میں تھے جس کے نتیجے میں اخوان المسلمون کو مزید مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ چونکہ اسرائیل کی توجہ ان گروہوں پر تھی جو مسلح جدوجہد میں مصروف تھے اس لیے اخوان بغیر کسی قابل ذکر اسرائیلی مداخلت کے اپنا کام آگے بڑھاتے رہے۔ اخوان نے اپنا پیغام پہنچانے اور لوگوں کو اپنے ساتھ لانے کے لیے نئی تدابیر پر عمل کیا۔ مقبوضہ علاقے میں مختلف تنظیمیں' لائبریریاں اور کھیلوں اور سماجی سرگرمیوں کے مختلف کلب قائم کیے۔ زکوۃ کے ذریعے ہزاروں غریب خاندانوں کی مدد کی۔ ہزاروں بچوں کی تعلیم کے لیے تحریک کے اپنے سکول تھے۔ یونی ورسٹی طلبہ کو قرضے دیے جاتے تھے۔ عوام سے رابطے کا ایک موثر اور اہم ذریعہ اوقاف کا انتظام تھا' غزہ میں اوقاف کے زیر انتظام سیکڑوں مکانات' دکانیں' بڑی عمارتیں' فلیٹس' گیراج اور ۲ ہزار ایکڑ زرعی زمین تھی۔ اوقاف کے انتظام کے لیے ائمہ سے لے کر گورکن تک ہزاروں افراد کام کرتے تھے لیکن اخوان کی دعوت پھیلانے کا اہم ذریعہ مساجد تھیں۔ اسرائیلی قبضے کے بعد مقبوضہ علاقوں میں مساجد کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ ۱۹۶۷ سے ۱۹۸۷ تک غزہ میں مساجد کی تعداد ۴ سو سے بڑھ کر آٹھ سو اور مغربی کنارے میں ۲ سو سے بڑھ کر ۶ سو ہو گئی۔ ان مساجد کے انتظام و انصرام کو اخوان نے اپنے ہاتھ میں رکھ کر ان سے تحریک کے مراکز کا کام لیا۔ یوں ایک پوری نسل تیار ہو گئی جو اسلام کو نظام زندگی اور جہاد ہی کو فلسطین کی آزادی کا ذریعہ سمجھتی ہے۔

حماس کی تشکیل

اخوان المسلمون ۱۹۴۸ کی عرب اسرائیل جنگ میں عملاً حصہ لے چکی تھی اور ۱۹۸۷ تک مختلف موقعوں پر اکا دکا مسلح کارروائیاں کرتی رہی۔ اس کے نتیجے میں ۱۹۸۳ میں شیخ احمد یاسین سمیت کئی

مجاہدین گرفتار ہوئے۔ اخوان کا اصل لائحہ عمل دعوت، تربیت اور اصلاح ہی تھا لیکن فلسطین کے خصوصی حالات میں مسلح جدوجہد کا راستہ بھی اختیار کرنا تھا۔

۱۹۸۵ سے ۱۹۸۷ کے دوران اخوان نے کئی دفعہ اسلامی تحریک مزاحمت کے نام سے فلسطینی عوام سے اسرائیل کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی اپیل کی۔ ۸ دسمبر ۱۹۸۷ کو ایک اسرائیلی ٹرک نے ایک چھوٹی گاڑی کو کچل دیا جس میں کئی فلسطینی مزدور ہلاک ہوئے۔ اس حادثے کے نتیجے میں پورے فلسطین میں احتجاج کی ایک شدید لہر اٹھی۔ یہی موقعہ تھا جب اخوان کی اصلاحی تحریک نے مسلح جدوجہد کا آغاز کیا اور حماس کی بنیاد رکھی گئی۔

مقاصد و حکمت عملی

حماس کا چارٹر اگست ۱۹۸۸ میں جاری ہوا، جس کے مطابق یہ اخوان المسلمون کا باقاعدہ حصہ ہے۔ فلسطین کے متعلق حماس کا موقف یہ ہے کہ اس کی حیثیت اسلامی وقف کی ہے جس میں افراط و تفریط یا اس کے کسی حصے سے دستبردار ہونا شرعاً ناجائز ہے۔ اس لیے مسئلہ فلسطین کا نام نہاد پر امن حل اور اس بارے میں عالمی سطح پر ہونے والی کوششیں حماس کے عقیدے کے خلاف ہیں۔ مسئلہ فلسطین کے حل کا واحد راستہ جہاد ہے۔ اس کے لیے مقامی، عرب اور عالم اسلام کی سطح پر مسلمانوں میں جہاد کی روح پھونکنا اور اسلامی شعور بیدار کرنا تمام باشعور مسلمانوں کا فرض ہے۔ چنانچہ حماس اپنے اہداف کے حصول کے لیے صرف مسلح جدوجہد ہی کو ضروری نہیں سمجھتی، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ سیاسی، فکری اور سماجی سطح پر بھی بھرپور کام کر رہی ہے۔

حماس کے چارٹر کے دیگر اہم نکات درج ذیل ہیں:

نئی نسل کی اسلامی تربیت کرنا۔

آزادی کی جدوجہد میں مردوں کے شانہ بشانہ خواتین کو کردار ادا کرنے کا موقعہ دینا۔

اسلامی فن کو ترویج و ترقی دینا اور اس کو تحریک کے مقاصد کے لیے استعمال کرنا۔

قومی وحدت اور باہمی امداد و تعاون کے لیے کام کرنا۔

دنیا کے دوسرے حصوں میں تحریکات اسلامی کے ساتھ یک جہتی و تعاون کی راہیں تلاش کرنا۔

شخصیات کی تشہیر یا شخصیات کے خلاف پروپیگنڈے سے اجتناب کرتے ہوئے حق پر مبنی موقف پر توجہ رکھنا۔

فلسطین کی قوم پرست تحریکوں کے ساتھ مشترکہ مفادات پر اتفاق و اتحاد کرنا۔

حماس تنظیم آزادی فلسطین کو اپنے سے قریب سمجھتی ہے اور جس دن تنظیم آزادی فلسطین

نے سیکولرازم ترک کر کے اسلام کو اختیار کر لیا، حماس کے افراد اس کے سپاہی بننے میں فخر محسوس کریں گے۔

حماس عرب حکومتوں کو خبردار کرتی ہے کہ صیہونی ان کو اس کشمکش سے الگ کر کے فلسطینیوں کو تنہا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو یہ بات اچھی طرح سمجھنا چاہیے اور اپنے اپنے ملک میں اسلامی تحریکات کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔

- حماس اپنے آپ کو ایک اسلامی تحریک سمجھتی ہے جو دوسرے ادیان کے پیروکاروں کے ساتھ مکمل رواداری اور پرامن بقائے باہمی کی قائل ہے۔

پروگرام اور سرگرمیاں

حماس اخوان المسلمون کا تسلسل ہے، لہٰذا اخوان نے ادبی، سماجی، جسمانی اور دینی سرگرمیوں کے لیے جو جال غزہ اور مغربی کنارے میں پھیلایا تھا، حماس نے اس سلسلے کو بھرپور انداز میں جاری رکھا۔ اپنی دعوت پھیلانے کے لیے حماس مختلف فورمز، سیمینار، ثقافتی نمایشوں اور دوسرے اجتماعی پروگراموں کا انعقاد کرتی ہے۔ اس سلسلے میں تعلیم یافتہ طبقے اور تعلیمی اداروں پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کتابچے، ہینڈبل چھپوا کر تقسیم کرنا، شہدا کی یاد میں پروگرام کرنا، مختلف تاریخوں پر بڑے بڑے عوامی مظاہرے اور جلوس نکالنا حماس کی سرگرمیوں کا حصہ ہے۔ عام انتخابات کی عدم موجودگی میں یہ کہنا تو مشکل ہے کہ حماس کو عوام کی فی صد کتنی اکثریت کی حمایت حاصل ہے، لیکن یونی ورسٹی یونینوں، ایوان ہائے تجارت، مزدور یونینوں اور اس طرح کے دوسرے اداروں کے انتخابات میں حماس بھرپور حصہ لیتی ہے اور کسی بھی دوسرے سیاسی گروپ سے زیادہ ووٹ لیتی ہے۔

سیاسی و سماجی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ حماس کا عزالدین القسام بریگیڈ عسکری سرگرمیاں کرتا ہے۔ اپنے کم وسائل اور فلسطین پر اسرائیل کی مکمل فوجی گرفت کے باوجود حماس کے عسکری شعبے نے نہایت اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔ پتھر مارنے سے مشہور ہونے والی یہ تحریک اب فدائیانہ حملے کر رہی ہے جس نے اسرائیل اور اس کے سرپرست امریکہ کو ہلا دیا ہے۔ ۱۹۹۴ میں ایک انتہا پسند یہودی گولڈ اسٹائن نے الخلیل کی مسجد ابراہیمی میں ۶۰ نمازیوں کو شہید کیا، اس کے بعد سے حماس نے اب تک ۱۱ فدائیانہ کارروائیاں کی ہیں جن میں ۱۰۰ کے قریب یہودی ہلاک ہو چکے ہیں جن کی اکثریت فوجیوں کی ہے۔ ان میں سے کچھ حملے اسرائیل کے دارالحکومت تل ابیب میں کیے گئے۔ حماس کا عسکری شعبہ اسلام کے اصولوں کے مطابق فوجی اہمیت کے اہداف کو نشانہ بناتا ہے اور ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ شہری آبادی کا کم سے کم نقصان ہو۔

خارجہ تعلقات

حماس بیرونی دنیا، خاص طور سے مسلمان ممالک میں ذرائع ابلاغ اور اسلامی تحریکوں سے رابطوں کے ذریعے اپنا موقف پہنچانے کا اہتمام کرتی ہے۔ اس وقت ایران، شام اور اردن میں حماس کے باقاعدہ سرکاری طور پر تسلیم شدہ دفاتر موجود ہیں۔ چونکہ باقی دنیا میں حکومتیں حماس کے نام سے دفتر کھولنے کی اجازت نہیں دیتیں، اس لیے مختلف ناموں سے اس مقصد کے لیے دفاتر کھولے گئے ہیں، جو ذرائع ابلاغ میں اپنا موقف پہنچانے اور فنڈ اکٹھا کرنے کا کام کرتے ہیں۔

حماس اور پی ایل او

حماس، پی ایل او کے ساتھ برادرانہ تعلقات رکھنا چاہتی ہے لیکن پی ایل او کے سیکولرازم کو گوارا نہیں کرتی، اس پر تنقید کرتی ہے۔ جب سے پی ایل او نے اسرائیل کو تسلیم کر کے اس کے ساتھ صلح کی ہے اور یاسر عرفات کی محدود مختاری پر مبنی فلسطینی اتھارٹی نے مقبوضہ عرب علاقوں کا انتظام سنبھالا ہے، حماس کے لیے مشکلات مزید بڑھ گئی ہیں۔ پہلے تو براہ راست اسرائیل کے ساتھ ٹکر تھی لیکن اب یاسر عرفات کی فلسطینی اتھارٹی اسرائیل کی ہدایات اور پروگرام کے مطابق حماس کی بیخ کنی میں مصروف ہے۔ اس کے باوجود حماس، بڑی حکمت کے ساتھ یاسر عرفات کے ساتھ براہ راست ٹکراؤ سے ممکنہ حد تک احتراز کرنے کی بھرپور کوشش کرتی ہے۔

موجودہ صورت حال میں جب کہ یاسر عرفات، تمام عالمی طاقتوں اور خاص طور پر امریکہ اور عرب ممالک کی حمایت سے اسرائیل کے ساتھ "امن" کو فروغ دے رہے ہیں، حماس کی جدوجہد کا انجام کیا ہوگا، یہ آنے والے حالات ہی بتائیں گے۔ جوں جوں وقت گزر رہا ہے، فلسطینی عوام میں حماس کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ یاسر عرفات کی نام نہاد خود مختاری اسرائیل کے قبضے کی ایک بدتر صورت ہے، اسرائیلی فوج جب چاہے جہاں چاہے "خود مختار" فلسطینی علاقوں کے اندر گھس کر کسی قسم کی کارروائی کر سکتی ہے جیسا کہ گذشتہ عرصے میں حماس کے بم حملوں کے بعد ہوتا رہا۔ ان کارروائیوں میں اسرائیلی فوج نے مقبوضہ علاقے میں کئی مجاہدوں کے گھروں کو بم سے اڑایا اور کئی لوگوں کو گرفتار کیا۔

شیخ احمد یاسین اور حماس

"انتفاضہ جاری رہے گا اور اس کے ساتھ ساتھ فلسطینی قوم پر مصائب ٹوٹتے رہیں گے اور ہم اپنے مضبوط موقف کے ساتھ مزاحمت جاری رکھیں گے۔ یہ صرف اللہ کو علم ہے کہ یہ کشمکش کب تک جاری رہے گی"۔ یہ الفاظ فلسطین کے اس بطل جلیل کے ہیں جس نے باطل کے مقابلے میں بیسویں صدی میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ کر دی ہے۔ ۵۸ سالہ شیخ احمد یاسین جن کا جسم، سر کے

سے بچانا چاہتی ہے ' اور دعوت دین میں اپنا حقیر مگر سچی بات ہے نہایت قیمتی حصہ ڈالنا چاہتی ہے تو اسے کچھ حقیقی اور بہت سے موہوم خدشات کی دیوار چین دکھا دی جاتی ہے ۔ مجھے اصلاحی صاحب کے استدلال میں چھپے ہوئے درد دل سے کوئی اختلاف نہیں ' لیکن کیا خواتین کی راہ میں کارِ دعوت صرف قلم ہے ؟ کیا صرف دعائیں یہ کام کرلیں گی ؟

واقعہ یہ ہے کہ اگر کردار میں پختگی نہ ہو تو چار دیواری میں بند عورت پر بھی سب کچھ تھوپا جا سکتا ہے اور اگر مضبوطی ہو تو پھر کالج ' مدرسہ ' بازار اور مطب بھی اس کی عفت مآبی کے گواہ بنتے ہیں ۔ ایسے میں اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے والی طالبات اور خواتین کے راستے کی تنگنائیوں کو کچھ کشادہ کرنا چاہیے نہ کہ مزید تنگ ۔

(۲)

عدالتی فیصلے کے بارے میں

شہزاد الحسن چشتی

پاکستان کی عدالت عالیہ کے فیصلے پر "اشارات" (مئی ۹۶) کو وقیع اور جامع قرار دینے کے باوجود "کچھ عدالتی فیصلے کے بارے میں" (جون ۹۶) صاحب مضمون نے چند باتوں سے اختلاف کیا ہے ۔ صاحب مضمون کو "اشارات" میں judge-made-laws کا دروازہ کھولنے کی تائید دکھائی دیتی ہے ۔ اس کے لیے انھوں نے "عدالتی آمریت" اور "عدالتی شریعت" کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں ' اور یہی ان کا بنیادی نکتہ اختلاف ہے ۔ اپنے نکتہ کے تائید میں انھوں نے "حاکم خاں کیس" ۱۹۹۲ کا حوالہ دیا ہے جس میں جسٹس (ر) نسیم حسن شاہ نے ' ان کے مطابق ' قرارداد مقاصد کی روح کو مسخ اور حیثیت کو مجروح کر دیا ہے ۔ دوسری مثال عدالت عالیہ کے موجودہ فیصلے سے ہے جس میں ' ان کے مطابق ' فیڈرل شریعت کورٹ کی روح سلب کر لی گئی ہے ۔ ان حوالوں سے انھوں نے عدلیہ کو خاصا ناقابل اعتبار ٹھہرانے کی کوشش کی ہے اور کچھ زیادہ ہی الفاظ استعمال کیے ہیں ۔ پارلیمنٹ کے ارکان کے بارے میں صاحب مضمون کی خوش فہمی کی کوئی بنیاد مجھے محسوس نہیں ہوتی ۔ ان کے اخلاق ' کردار اور اپنے مفادات کے لیے سب کچھ کر گزرنے کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سب کچھ زبان زدعام ہے ۔ دراصل مملکت کا نظام چلانے میں عدلیہ اور مقننہ دونوں کا اپنا اپنا کردار ہے اور دستور نے باہمی توازن کے لیے حدودکار تجویز کی ہیں ۔ دستور اور قانون کی تعبیر عدلیہ کا فریضہ ہے ۔ دستور کی کسی شق یا کسی قانون کے قرآن و سنت کے مطابق ہونے یا نہ ہونے کا بہتر فیصلہ عدلیہ ہی

سوچ بچار کر کے کر سکتی ہے۔ قرارداد مقاصد کو عدلیہ نے بالائے دستور حیثیت دے رکھی 'لیکن ہمارے حکمرانوں نے اس کا کتنا لحاظ رکھا؟ فیڈرل شریعت کورٹ کو نیک نیتی سے بنایا جاتا تو اس کی دوسری ہی شان ہوتی اور عدالت کو اس کے بارے میں ریمارکس دینے کی گنجایش نہ ملتی۔ اشارات میں اعتدال اور توازن سے بات کہی گئی ہے اور عدلیہ کو بھی توجہ دلائی گئی ہے۔

قانون کی حدود میں رہتے ہوئے عدالت عالیہ کے دلائل سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ عدالت عالیہ میں کسی اور مقدمے کے دوران عدالت نئے اور مضبوط دلائل کی روشنی میں اپنے پچھلے موقف میں تبدیلی کر لے' جیسا کہ ڈوسا بھائی کیس اور دوسرے مقدموں میں ہوا۔ یہی بات "اشارات" میں کہی گئی ہے۔ "وقت آ گیا ہے کہ وہ (عدالت عالیہ) جرات کر کے اپنے سابقہ فیصلے پر نظر ثانی کرے اور قرارداد مقاصد (۲۔ اے) کو دستور کا بالاترین بنیادی ناقابل ترمیم حصہ قرار دے اور دستور کی جو دفعہ یا قانون اس سے متصادم ہو' اس پر عمل درآمد کو غیر موثر کر دے۔ پھر ۲۔اے سے استدلال کر کے 'جب اور جیسا موقع آئے وہ اسلام کے تمام بنیادی حقوق' جمہوری اصول اور عدلیہ کی آزادی کو بھی یہی مقام دے کہ یہ چیزیں بھی ناقابل ترمیم ہیں"۔ (ص ۱۶)

"کن اصحاب عدل کے ہاتھ میں بغیر کسی گرفت اور جواب دہی کے اختیار دینے کی تائید کی جا رہی ہے؟" صرف ایک موہوم خدشہ ہے۔ حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ پاکستان کا موجودہ دستور بہت حد تک اصحاب عدل کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ ہر فیصلہ لکھتے وقت انھیں قانون اور دستور کی بالادستی کا بھی خاص خیال رکھنا ہوتا ہے' اور ساتھ ہی اپنی عزت و وقار کا بھی۔ اس لیے کہ یہ فیصلہ نہ صرف ملک میں بلکہ دنیا بھر میں قانونی ماہرین' اصحاب دانش اور دوسرے اہل علم کی نگاہ میں ان کا مقام متعین کرے گا۔ جواب دہی کا یہ ایک اہم پہلو ہے۔ اگر عدلیہ کے سب ہی اصحاب سیکولر ذہن کے ہو جائیں تو بھی دستور ان کو اپنی گرفت میں رکھے گا اس لیے کہ انھیں اسی دستور کے حدود میں رہتے ہوئے تعبیر و تشریح کرنی ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ کسی بات کی اہمیت کو بڑھا دیں جو اسلام کے نقطہ نگاہ سے کم اہمیت کی متقاضی ہو اور دوسری کسی بات کی اہمیت کم کر دیں جو اسلام کے حوالہ سے زیادہ اہمیت چاہتی ہو' لیکن یہ ممکن نہیں کہ قرارداد مقاصد حذف کر دیں' اسلام کو بحیثیت مذہب کے نکال دیں' قرآن و سنت کے خلاف قانون نہ بنانے والی شق ختم کر دیں' بنیادی حقوق ختم کر دیں۔ الحمدللہ کہ ہمارے معتدبہ اصحاب عدل تابناک کردار کے حامل رہے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی رائے اپنی جگہ کہ تاریخ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدان جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں میں ہوئی ہیں۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ عدالت کے ایوانوں سے ہی انصاف ملتا ہے!


قومی مشروب
نورس
NOORA
لذت
ٹھنڈک
اور
تازگی
کے لئے
یہی بہترانت

رسائل و مسائل

استخارے کا حاصل

یہ سوال اکثر ذہنوں میں ہوتا ہے کہ استخارے کا حاصل کیا ہے۔ کسی کام پر شرح صدر اور اطمینان قلب' یا کوئی خواب' یا کوئی اشارہ غیبی۔ اس معاملے میں ہم مولانا اشرف علی تھانوی کی تحقیق درج کر رہے ہیں' جو امید ہے کہ مفید ہوگی۔

احکام استخارہ کا حاصل یہ ہے کہ اے اللہ' اگر یہ معاملہ میرے لیے خیر ہو تو میرے قلب کو متوجہ کر دے' ورنہ میرے دل کو ہٹا دے۔ اس کے بعد اگر اس طرف دل متوجہ ہو' تو اس کے اختیار کرنے کو ظناً خیر سمجھے۔ دعا کا یہ حاصل کہ قلب متوجہ ہو جائے' اور یہ ثمرہ کہ جس طرف قلب متوجہ ہو اس کو اختیار کر لے' یہ مشہور قول ہے' اور نووی وغیرہ اسی طرف گئے ہیں (فتح الباری)۔ مگر دلائل سے یہ راجح ثابت ہوا کہ اس انشراحِ قلب کے انتظار کی ضرورت نہیں' بلکہ جو مناسب سمجھے' کر لے۔ یہ قول عزالدین عبدالسلام کا ہے۔ اس دعا کی برکت یہ ہوگی کہ' باوجود اس کے ارادہ کے' خیر ہی کا صدور ہو گا' البتہ خیر عام ہے خواہ دنیوی ہو یا دینی۔ ترجیح کے دلائل حسب ذیل ہیں:

طبقات شافعیہ میں ایک تحقیق کے مطابق' یہ جو عام طور پر مشہور ہے کہ استخارہ سے مقصود استخبار ہے' یہ صحیح نہیں۔ یعنی استخارہ کا مقصد یہ نہیں کہ ہم کو کسی کام میں جو تردد ہو رہا ہے' کہ یہ کام ہمارے لیے خیر ہے یا نہیں' استخارہ کرنے سے یہ تردد رفع ہو جائے گا' اور ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کام ہمارے لیے خیر ہے' یا شر' پھر جو خیر ہو گا اس کو اختیار کریں گے۔ چنانچہ' ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات استخارہ کے بعد بھی وہ تردد رفع نہیں ہوتا' اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان دونوں باتوں میں سے کون سی بات مفید ہے۔ اس صورت میں لازم آتا ہے کہ رفع تردد کے لیے استخارہ لاحاصل ہوا' اور تردد رفع نہیں ہوا تو نعوذ باللہ شارع کا یہ حکم گویا عبث ہی ہوا۔ ظاہر ہے کہ شارع کی طرف سے کبھی ایسی بات کا حکم نہیں ہو سکتا جو عبث ہو۔

معلوم ہوا کہ استخارہ کا یہ مقصود نہیں کہ کوئی بات اس کے ذریعہ سے معلوم کر لی جائے جس سے تردد رفع ہو' اور اس کام کی دونوں شقوں میں سے ایک شق کی ترجیح ضرور قلب میں آ جائے' پھر

راجح جانب پر عمل کیا جائے ۔ بلکہ استخارہ کی حقیقت یہ ہے کہ استخارہ ایک دعا ہے ' جس کے ذریعہ سے بندہ حق تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ میں جو کچھ کروں اسی کے اندر خیر ہو ' اور جو کام میرے لیے خیر نہ ہو وہ کرنے ہی نہ دیجیے ۔ پس جب وہ استخارہ کر چکے تو اس کی ضرورت نہیں کہ سوچے کہ میرے قلب کا زیادہ رجحان کس بات کی طرف ہے اور پھر جس بات کی طرف رجحان ہو اس پر عمل کرے ' اور اسی کے اندر اپنے لیے خیر کو مقدر سمجھے ' بلکہ اس کو اختیار ہے کہ دوسرے مصالح کی بنا پر جس بات میں ترجیح دیکھے اسی پر عمل کرے اور اسی کے اندر خیر سمجھے ۔ شرح صدر نہ ہو ' تو بھی جو کرے اس میں خیر ہو گا ۔ حدیث میں شرح صدر کی شرط نہیں ہے ۔ (طبقات الشافعیۃ ج ۵ ' ص ۲۵۸) ۔

اس وقت میرے نزدیک بھی ذوقاً یہی اقرب معلوم ہوتا ہے جو طبقات شافعیہ سے نقل کیا گیا ہے ۔ نیز اصول شرعیہ میں سے ایک اصل سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے ۔ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ الہام شرعاً حجت نہیں ۔ مشہور ہے کہ اس کے ذریعہ سے قلب میں ایسی بات کا اللہ کی جانب سے القا ہوتا ہے جس کے اندر خیر ہوتی ہے ' لہٰذا اس القا پر ہی عمل کرنا چاہیے ' چونکہ وہ القا الہام ہے اور اسی پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ' تو گویا الہام پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ۔ لہٰذا اگر استخارہ کے اس حاصل کو صحیح مانا جائے ' تو الہام کا شرعاً حجت ہونا لازم آتا ہے ' جو صحیح نہیں ۔ استخارہ کا حاصل قلب میں اس بات کا القا ہونا ہے جس میں خیر ہے اور خیر اسی میں ہے ۔

فتح الباری میں عزالدین بن عبدالسلام کا قول نقل کیا گیا ہے : " آدمی وہ کرے جو اس کو زیادہ موافق اور قرین عقل لگے ۔ ابن سعودؓ کی بعض احادیث میں آخر میں ثم یعزم " پھر ارادہ پختہ کرے " کے الفاظ آئے ہیں ۔ جابرؓ نے کہا ہے کہ حضورؐ ہمیں تمام کاموں میں استخارہ کی تعلیم دیتے تھے ۔ وہ بھی جن میں تردد ہوتا ' وہ بھی جن میں نہ ہوتا ۔

اس تحقیق مذکور کے ایک مدت بعد ' ایک فاضل دوست نے جامع صغیر سیوطی کی ایک حدیث دکھلائی جس کے ظاہر الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ استخارہ کے بعد میلان قلب کا انتظار کیا جائے ۔ وہ حدیث یہ ہے : " جب تجھے کوئی اہم معاملہ پیش آجائے تو اپنے رب سے سات مرتبہ استخارہ کر ' اس کام کو اپنا جس کی طرف تیرا دل رغبت کرے ' بے شک بہتری اسی میں ہوگی ۔ یہ حدیث تحقیق سابق سے متعارض ہے ۔ جواب یہ ہے کہ واقعی ظاہراً باہم تعارض ہے ۔ آگے دو ہی صورتیں ہیں ۔ یا اس حدیث کے ضعف کی بنا پر تحقیق سابق کو ترجیح دے جائے ' یا اس حدیث کے الفاظ کی تاویل کی جائے ۔ اولاً احقر کے ذہن میں یہی دو جواب آئے ۔ اور ان دونوں جوابوں کو ضبط بھی کر لیا ۔ مگر بعد ضبط کے شرح صدر نہیں ہوا اور جتنی دلیلیں ذہن میں آئی تھیں ' سب مجروح و مخدوش معلوم ہوئیں ۔ پھر حق تعالیٰ سے دعا کی ۔ دعا کے بعد جو قلب پر وارد ہوا ' اس کو لکھتا ہوں ۔ وہ یہ کہ حدیث کے ظاہر الفاظ

سے ہٹ جانا خلاف اصول ہے۔ لہٰذا اس ظاہر کا قائل ہونا ہی متعین ہے۔ باقی تحقیق سابق کی ترجیح کی بنا تین امر تھے۔ ایک یہ کہ کسی حدیث میں دل میں القا کے انتظار کا ذکر نہیں۔ دوسرے یہ کہ بعض اوقات کسی شق کی ترجیح خیال میں نہیں آتی تو اس صورت میں استخارہ عبث ہوا۔ تیسرے یہ کہ اگر کسی شق کی ترجیح خیال میں آگئی تو اس پر عمل کرنا الہام پر عمل ہوا' جو شریعت میں حجت نہیں۔ مگر بعد تامل ان سب امور کا جواب سہل ہے۔ اول کا یہ کہ 'اس بارے میں بنیاد روایات کا ساکت ہونا ہے' مگر ناطق مقدم ہے ساکت پر' اور یہ حدیث ناطق ہے۔ دوسری کا یہ کہ 'یہ باعتبار اکثر کے ہے اور اس کے خلاف نادر ہے اور للاکثر حکم الکل اور النادر کالمعدوم کا اعتبار احکام کثیرہ میں کیا گیا ہے تو اس سے عبث ہونا لازم نہیں آتا۔ تیسری کا یہ کہ 'الہام کا حجت نہ ہونا اس معنی میں ہے کہ اس پر عمل واجب نہیں' یہ نہیں کہ جائز بھی نہیں۔ خود بعض احکام میں ارشاد ہے: استفت قلبک۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دل میں جو وارد ہوا' اس پر عمل جائز ہے' البتہ یہ شرط ہے کہ دونوں شقیں شرعاً جائز ہوں۔ باقی رہا حدیث کا ضعف' سو اگر تعارض ہوتا تو قوت سے ایک کو ترجیح دی جاتی' جب تعارض نہیں' جیسا اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ناطق اور ساکت میں تعارض نہیں ہوتا' تو حدیث ضعیف کو دو میں ایک صورت کے لیے مرجح اور موید کہہ سکتے ہیں۔ اس کے نظائر احکام میں بکثرت ہیں۔ اس لیے اس باب میں قول مشہور ہی کو ترجیح معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم!

پس اقرب الی الادب و اجمع للدلائل یہ ہے کہ استخارہ کے بعد اگر کسی شق کا رجحان قلب میں آجائے تو اس پر عمل کرے' اور اگر کسی کا رجحان نہ ہو تو جس شق پر چاہے عمل کرلے۔ اس تفصیل سے دونوں قولوں پر' اور بواسطہ دونوں قولوں کے سب دلائل پر بھی عمل ہو جائے گا۔ واللہ اعلم!

احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں فصلیں دکھلا کر دوسرے علما سے بھی مشورہ کر لیا جائے۔ (۲ محرم ۵۸ ۱۳)۔

جو اپنے لیے' وہی دوسرے کے لیے

پیارے نبیؐ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن عرش کے نیچے سب سے پہلے جگہ پانے والے وہ ہوں گے جن کا فیصلہ دوسروں کے لیے وہی کچھ تھا جو اپنی جان کے لیے تھا۔ یہ ایک بہت مشکل امتحان ہے شاید دوسروں کے معاملے میں اتنا مشکل نہ ہو' لیکن میاں کی دوسری یا پہلی بیوی کے معاملے میں یہ سخت آزمائش کا باعث بن جاتا ہے۔ میں اس بارے میں اتنی پریشان ہوں کہ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کاش میں کوئی پتھر ہوتی اور اس آزمائش میں نہ پڑتی۔ کیوں کہ گھر کے سامان' لباس اور دیگر چیزوں کے بارے میں تو الحمدللہ کبھی بھی مجھے فکر نہیں ہوئی بلکہ دل چاہتا ہے کہ ان کی ہر چیز مجھ سے بہتر ہو' زیادہ ہو تب بھی کوئی پرواہ نہیں۔ لیکن میاں کے سلوک اور قلبی تعلق کے معاملے میں' میں ہمیشہ ہی اس حدیث پر عمل کرنے

میں ناکام رہتی ہوں کیونکہ میں یہ پسند نہیں کرتی کہ قلبی تعلق و محبت کے معاملے میں میرے میاں ان کے ساتھ ویسے ہی ہوں جیسے میرے ساتھ ہیں۔ یہ نہیں کہ میں نے ان کا دل ہٹانے کی کوشش کی ہو' اللہ جانتا ہے اس سلسلے میں' میں اپنی استطاعت کے حد تک محتاط رہتی ہوں' لیکن دل پر میرا اختیار نہیں جو اس چیز کو پسند نہیں کرتا' اور اگر ایسی صورت حال پیش آ جائے تو باوجود اس کے کہ میں دل کو سمجھاتی ہوں اور اکثر کامیاب ہو جاتی ہوں کہ بہرحال ان کا بھی حق ہے اور میاں کو ان کا بھی اتنا ہی خیال رکھنا چاہیے لیکن کئی دفعہ اس سلسلے میں ناکام ہو جاتی ہوں اور دل میں ناراض رہتی ہوں۔

اللہ رب کریم ہمارا مواخذہ نہ کرے اور ہم سے آسان حساب لے۔ اپنے کرم اور اپنی رحمت سے نیکیوں میں سبقت حاصل کرنے کی توفیق دے۔ اسی سلسلے میں آپ کے مخلصانہ مشورے کی حاجت مند ہوں۔

آپ کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ دوسروں کے لیے وہی پسند کرنا جو آدمی اپنے لیے پسند کرے کوئی آسان کام نہیں۔ اور جب معاملہ سوکن' رقیب یا حریف کا ہو تو پھر تو بڑا ہی کٹھن ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے تاکید فرمائی ہے کہ "وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ، اِعْدِلُوْا" اور "اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ" اور "وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا"

آپ کو خود آپ کا دل صحیح مشورہ دے گا اور آپ کو صحیح راہ پر رکھے گا' عدل و انصاف پر بھی چلائے گا' افراط و تفریط اور غلو سے بھی بچائے گا' اپنے نفس سے ایسے مطالبات کرنے سے بھی جو نہ دین نے کیے ہوں نہ فطرت کے مطابق ہوں' اور خواہ مخواہ کی دل شکستگی اور مایوسی سے بھی' محفوظ رکھے گا۔ اگر آپ چند باتیں سمجھ لیں اور دل میں رکھیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ بہت غفور و رحیم ہیں۔ ان کا ہر معاملہ سرتا سر شفقت و رحمت کا ہوتا ہے۔ ان کو ہمارے مواخذے یا سخت حساب کی کوئی خواہش نہیں۔ اسی لیے جو کچھ بھی پڑتی ہے اچھی ہو یا بھلی---- تربیت اور کسب اجر کا ایک موقعہ ہے جو وہ عنایت کرتے ہیں۔ دوسرے' نہ وہ کوئی عمومی مطالبات ایسے کرتے' نہ خصوصی' جن کا پورا کرنا ہماری استطاعت سے باہر ہو۔ جو معاملات ہمارے بس میں ہیں' انھی پر مواخذہ ہے۔ جو بس میں نہیں' ان پر کوئی مواخذہ نہیں۔

۲۔ جو امور اختیاری ہیں انھی کا مطالبہ ہے' اور ان میں خطا و گناہ ہو جائے تو رنج ہونا اور ندامت ہونا ضروری ہے۔ استغفار بھی' اور اصلاح احوال کی کوشش بھی۔ جو امور غیر اختیاری ہیں' ان میں خطا پر خواہ مخواہ دل گرفتہ اور مایوس ہونا صحیح نہیں۔ ہاں' یہ قلب منیب کی صفت ہے کہ وہ ان پر بھی رجوع کرتا ہے' استغفار کرتا ہے' پھر اطمینان سے اپنی اطاعت شعاری کے کام میں لگ جاتا ہے۔

۳۔ آدمی کے سارے اعضا اس کے اختیار میں ہیں' سوائے دل کے۔ آپ کو زبان چلانے' ہاتھ پاؤں چلانے' کسی بھی انداز و رنگ سے بات کرنے کا اختیار ہے۔ لیکن دل میں کیا خیالات آتے ہیں' کیا جذبات آتے ہیں' کیا احساسات پیدا ہوتے ہیں' یہ آپ کے اختیار میں نہیں۔ اس لیے ان پر

کوئی مواخذہ بھی نہیں۔ ان پر خواہ مخواہ کی دل گرفتگی اور رنج و افسوس بے سود اور غیر مطلوب ہے۔ دل کی خبر تو فرشتوں کو بھی نہیں ہوتی۔ صرف اللہ جانتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ اس لیے کیفیات کی طلب و جستجو تو مطلوب ہے، لیکن کیفیات فی نفسہٖ مطلوب نہیں۔ عمل مطلوب ہے۔

۴۔ اِلاَّ یہ کہ آپ دل میں کوئی چیز یا خیال اپنے ارادے اور کوشش سے لائیں، خود سے آجائیں تو اسے گلے لگائیں اور بٹھائے رکھیں، اس تاریکی کو اللہ کے ذکر کے نور سے دور کرنے کی کوشش نہ کریں، یا اس خیال کے مطابق عمل شروع کر دیں، اس صورت میں بقدر خطا مواخذہ ہو سکتا ہے۔ اگر آپ اس داغ کو استغفار سے دھو نہ دیں۔ مثلاً حسد کا جذبہ دل میں آجاتا ہے، غصہ آجاتا ہے، دل تنگ ہوتا ہے، نیک عمل کو لوگوں کے دیکھنے سے دل کی خوشی ہوتی ہے، تو ان پر کوئی مواخذہ نہیں۔ پریشانی صرف اس قدر کافی ہے کہ فوراً اللہ کو یاد کریں تاکہ یہ غلط خیال کافور ہو جائے۔ اس کو دل میں صوفہ سیٹ اور بسترنہ فراہم کریں، نہ اس کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیں۔

۵۔ میاں بیوی، یا بیوی بیوی کے درمیان تو بہت نازک قلبی اور حسی معاملات ہوتے ہیں۔ انسانی فطرت و استطاعت کے پیش نظر قرآن نے خود ہی اس معاملہ میں چھوٹ دی ہے۔ مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِہٖ (الاحزاب ۳۳: ۴) وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِیْلُوْا کُلَّ الْمَیْلِ (النساء ۴: ۱۲۹)۔ اس کا اطلاق بیوی اور سوکن پر بھی ہو گا۔

سوکن کے معاملے میں، بلکہ محبت میں کسی بھی شریک و رقیب کے بارے میں، انسان کے دل میں تنگی، ناراضگی، عدم قبولیت آجانا، یا زبان سے ناروا کلمات کا نکل جانا، یا محبوب کی محبت حاصل کرنے کے لیے حد سے گزر جانا، عین فطری ہے۔ آپ خانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال پڑھ لیں۔ ازواج کے درمیان باہم نزاع بھی ہوتی تھی، زبان سے سخت و نازیبا کلمات بھی نکل جاتے تھے، محبوبؐ کی توجہ کے لیے کشمکش بھی ہوتی تھی۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُنَّ وَرَضِیْنَ عَنْہُ۔ قرآن میں (الاحزاب اور تحریم وغیرہ میں) بھی ذکر ہے اور سیرت و احادیث میں تو بڑی تفصیلات محفوظ ہیں۔

۶۔ اس سے آپ کی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ ہروقت عورت بھی مایحب لنفسہ پر قادر نہیں ہوتی لیکن جس پر قادر نہ ہو اس پر نہ مواخذہ ہے نہ حساب نہ سزا۔

۷۔ آپ نے جو کیفیت لکھی ہے کہ دل کی تنگی اور عدم برداشت کی کیفیت صرف میاں کے سلوک اور قلبی تعلق کے معاملے میں ہوتی ہے، یہ عین فطرت کا تقاضا ہے، یہ حدیث کی خلاف ورزی بھی نہیں۔ آپ نے تو دل ہٹانے کی کوشش نہیں کی، آپ کے لیے یقیناً بڑا درجہ ہے۔ اگر آپ دوسرے کو گرائے بغیر اپنے میاں کی توجہ اور محبت زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرتیں تو بھی حدیث کی خلاف ورزی نہ ہوتی، جب تک آپ کی کوئی کوشش کسی دوسرے حکم شرعی کی خلاف ورزی نہ کرتی

کتاب نما

اسوۂ حسنہ، قرآن کی روشنی میں، محمد شریف قاضی۔ ناشر: فیروز سنز، لاہور۔ صفحات ۵۲۸۔
قیمت: ۲۵۰ روپے۔

بلاشبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی "سیرت طیبہ ایک بحر بیکراں اور ایک لا متناہی سمندر کی حیثیت رکھتی ہے" اور اس موضوع پر قلم اٹھانے والوں نے مختلف نیتوں، جذبوں اور ارادوں سے سیکڑوں اور ہزاروں کتابیں لکھی ہیں۔ محمد شریف قاضی صاحب کا مقصد یہ ہے کہ "سیرت طیبہ نے انسان کا جو مقصد زندگی مقرر کیا ہے، اسے سمجھا جائے اور صرف اسی کو زندگی کا نصب العین بنایا جائے"۔ (عرض مولف) مصنف کو دس بارہ سال تک ایک پس ماندہ ضلع کی دیہاتی اور ناخواندہ آبادی میں تحریک اسلامی کا کام کرنے کا موقع ملا۔ ان کا مشاہدہ ہے کہ عوام کی اکثریت آپؐ کے اسوہ حسنہ کے ان قابل تقلید پہلوؤں سے ناآشنا ہے جو ایک مسلمان کی شب و روز کی ایک اہم ضرورت ہیں۔ مصنف نے سیرت طیبہ کے پیغام پر زور دیتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہم سیرتؐ کے آئینے میں ایک اسلامی معاشرے کی تعمیر و تزئین کیوں کر کر سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے "اسوہ حسنہ" میں حیات رسولؐ کے ان اہم اور ضروری پہلوؤں کو اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے جن کی "ہر مسلمان کو بالعموم اور تحریک اسلامی کے کارکنوں کو بالخصوص شب و روز ضرورت پڑتی ہے"۔ (ص ۲۰)

آٹھ ابواب پر مشتمل اس کتاب کے مباحث و مطالب کو چھوٹی چھوٹی ذیلی اور ضمنی سرخیوں کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ مطالب کی تفہیم اور وضاحت کا یہ آسان طریقہ، مفید اور کامیاب ہے۔ (تاہم کتابت میں ذیلی سرخیوں کا نظام درست اور ہموار نہیں رہ سکا، نہ فہرست اور نہ متن میں)۔ عنوان کتاب "اسوہ حسنہ" کے ذیل میں "قرآن کی روشنی میں" کے الفاظ درج ہیں۔ چنانچہ مصنف نے ترجیحا اور اولاً قرآن پاک ہی سے استشہاد کیا ہے۔ یوں تو ماخذ کی فہرست میں ۳۶ کتب کے نام درج ہیں لیکن خاصی بڑی تعداد میں تلخیص تفہیم القرآن، تلخیص سیرت سرور دو عالمؐ، تلخیص محسن انسانیتؐ قسم کے حوالوں سے ایک تاثر تو یہ ہوتا ہے کہ مصنف نے بہت کچھ دوسروں سے اخذ کر کے اسے مرتب کر دیا ہے لیکن اس طرز تالیف کے کچھ فوائد بھی ہیں، مثلاً: یہ کہ بیشتر مطالب کے

استناد کی ذمہ داری مصنف کی اپنی نہیں رہتی' دوسرے یہ کہ اس طرز پر تالیف و تدوین میں نسبتاً آسانی رہتی ہے۔ مصنف نے واقعات کی تفصیل سے عموماً اجتناب برتا ہے' مثلاً غزوۂ بدر اور تبوک: پون پون صفحہ' فتح مکہ' غزوہ خندق: ایک صفحہ' غزوہ احد: سوا صفحہ۔ البتہ اسلامی نظام حیات کے مختلف پہلو عمدگی سے سامنے آجاتے ہیں۔

""اسوۂ حسنہ"" کو سیرت النبیؐ کے قومی مقابلے میں انعام بھی مل چکا ہے۔ سیرت نبویؐ کے شائقین کے لیے یہ ایک ایسی مفید کتاب ہے جو ذمہ داری اور احتیاط سے لکھی گئی ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

شاہنامہ بالاکوٹ' علیم ناصری۔ ناشر: ادارہ مطبوعات سلیمانی' اردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۲۶۴۔ قیمت: ۱۲۰ روپے۔

یہ کتاب گذشتہ صدی کی ابتدائی دہائیوں میں برپا ہونے والی تحریک جہاد و اصلاح کی منظوم تاریخ کی جلد اول ہے' جو پہلے شائع ہوئی تھی' اب اسے کچھ اضافوں کے ساتھ از سر نو مرتب کر کے پیش کیا گیا ہے۔ یہ جلد جنگ اتمان زئی تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد زیر تالیف ہے وہ جنگ پنج تار سے شروع ہو کر معرکہ بالاکوٹ پر انجام پذیر ہو گی۔

""شاہنامہ بالاکوٹ"" کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تیاری میں مولانا ابوالحسن علی ندوی' مولانا مسعود عالم ندوی' غلام رسول مہر اور شیخ محمد اکرام ایسے بلند پایہ محققین کی کاوشوں سے استفادہ کیا گیا ہے اور اس امر کا اہتمام کیا گیا ہے کہ واقعات میں رنگ آمیزی نہ ہو۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ آخر میں ضروری مقامات کی تشریح و توضیح کے لیے حواشی و تعلیقات کا اضافہ کیا گیا ہے جو مستند اور معتبر ماخذ پر مبنی ہیں۔ اکثر و بیشتر ماخذ کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔ شاہنامہ کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بلا کی روانی ہے اور ہر حصہ نظم علیم ناصری کی معلومات اور فن شاعری میں ان کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

تاریخ عموماً نثر میں لکھی جاتی ہے لیکن اگر شاعر مشاق اور پختہ کار ہو تو وہ تاریخ کے خشک بیانات کو دلچسپ اور پرتاثیر بنا دیتا ہے۔ اس طرح کی منظومات قوموں کی بیداری اور ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ماضی قریب میں حالی' شبلیؒ' اقبال اور ظفر علی خاں کی نظموں نے یہی کردار ادا کیا ہے۔ بعض شعرا نے جنگ ناموں اور شاہناموں کی صورت میں اسلاف کے ولولہ انگیز کارناموں کو محفوظ کرنے کی سعی کی ہے۔ فارسی میں فردوسی کا ""شاہنامہ"" اس کی عمدہ مثال ہے۔ فارسی اور اردو میں جو دوسرے جنگ نامے یا شاہنامے لکھے گئے ہیں وہ بھی طبائع پر خاص اثر ڈالتے ہیں۔ اردو میں حفیظ جالندھری کا ""شاہنامہ اسلام"" پڑھ کر یقیناً روح جھوم اٹھتی ہے۔ علیم ناصری کا ""شاہنامہ بالاکوٹ"" اسی نوع کی ایک طویل نظم ہے جس کا موضوع ہماری قومی و ملی تاریخ ہی کا ایک دور ہے۔ اس دور میں سید احمد

شہیدؒ اور ان کے رفقا کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑا اور انھوں نے مسلمانوں کو متحد و منظم کر کے اور ان میں روح جہاد پھونک کر طاغوتی طاقتوں کو جس طرح لرزہ براندام کیا، اس کی تفصیل اس نظم میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ مصلحین کی اصلاحی و تبلیغی کوششوں کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے مسلمان عوام اور خواص کی کمزوریوں اور تنگ نظری و کوتاہ فکری کے تباہ کن نتائج بھی بیان کیے گئے ہیں۔ غرضیکہ یہ نظم ہماری اجتماعی زندگی کا ایسا آئینہ ہے جس میں جھانک کر ہم ماضی میں اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کے اسباب و علل سے بخوبی آگاہ ہو سکتے ہیں اور اپنے حال اور مستقبل کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

علیم ناصری نے مبالغہ آرائی کی بجائے واقعہ نگاری کو ترجیح دی ہے۔ ان کا اسلوب بیان ولولہ انگیز اور ایمان افروز ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے زیر نظر کاوش کو "دینی جنگ نامہ" قرار دیتے لکھا ہے کہ "اس کا ہر ہر لفظ ایمان و یقین میں لپٹا ہوا اور جذبہ جہاد میں ملفوف ہے"۔ انھوں نے زبان پر شاعر کی، غیر معمولی قدرت کا بھی اعتراف کیا ہے۔ ان کے بقول اس نظم میں "کوئی لفظ بے جا اور بے محل استعمال نہیں ہوا"۔

ہمارے ہاں تضمین کا ایک معروف طریقہ یہ ہے کہ جس شعر یا مصرع کی تضمین کی جاتی ہے، اس کو واوین میں درج کر کے اس شاعر کا نام بھی لکھ دیا جاتا ہے جس کے کلام کی تضمین کی جاتی ہے۔ زیر نظر کتاب میں اس کا پورا اہتمام نہیں ہو سکا۔ کہیں واوین کا استعمال کیا گیا ہے اور کہیں شاعر کا نام دے دیا گیا ہے اور بعض مقامات پر دونوں امور کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ درج ذیل شعر کو فاضل مصنف نے علامہ اقبال سے منسوب کیا ہے:

بیا پیدا خریدار است و جان ناتوانے را پس از مدت گزر افتاد بر ما کاروانے را

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس شعر کا مصرع ثانی نظیری کا ہے جس کو اقبال نے تضمین کیا ہے اور پھر تضمین شدہ مصرع کی اصل صورت یہ ہے: "پس ازمدت گذار افتاد بر ما کاروانے را"

زیر نظر منظوم کاوش میں حواشی اور تعلیقات کا اہتمام یقیناً لائق تحسین ہے، لیکن حوالوں کے اندراج کا انداز بہتر بنانے کی ضرورت تھی۔ اگر حوالے مکمل کتابیاتی کوائف کے ساتھ دیے جاتے تو ان کی افادیت بڑھ جاتی۔ اصول یہ ہے کہ پہلی بار حوالہ مکمل کوائف کے ساتھ درج کیا جائے، پھر مختصر کوائف کے ساتھ، اور آخر میں کتابوں کی مکمل فہرست دے دی جائے۔ اسی طرح کتاب کے ساتھ ایک نقشہ ہونا چاہیے تھا جس میں جملہ متعلقہ مقامات دکھائے جاتے۔ مزید برآں پروف خوانی پر مزید توجہ کی ضرورت تھی۔ بلاشبہ "شاہنامہ بالاکوٹ" جناب علیم ناصری کی ایک قومی و ملی خدمت اور ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ اس سے اردو کے شعری ادب میں یقیناً گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ (ڈاکٹر رحیم بخش شاہین)

The Sabres of Two Easts، ڈاکٹر عطاء اللہ بوگدان گوپانسکی۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، بلاک ۱۹، مرکز ایف سیون، اسلام آباد۔ صفحات: ۴۴۸۔ قیمت ۳۰۰ روپے۔

عالمی ذرائع ابلاغ احیائے اسلام کی تحریکوں پر بنیاد پرستی کا لیبل لگا کر انھیں مطعون کرتے ہیں، مگر ہندو نسل پرستوں، یہودی انتہا پسندوں اور متعصب صلیبیوں سے ہمیشہ اغماض برتتے بلکہ "غض بصر" سے کام لیتے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ صدیوں پرانے، اس غیر منصفانہ رویے کے باوجود انھوں نے ہمارے بعض دانش وروں کی "دانش" پر اپنی "معروضیت" کی دھاک بٹھا رکھی ہے۔ مسلمان ایک طویل عرصے سے مغربیوں کے محکوم چلے آرہے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ مسلم ممالک میں نہ تو مسلم اسپین کی تاریخ صحیح تناظر میں پڑھائی جاتی ہے اور نہ سلطنت عثمانیہ کے صدیوں پر پھیلے ہوئے کارنامے اجاگر کیے جاتے ہیں، حالانکہ گذشتہ چار صدیوں کے حوالے سے وہ مسلمانوں کی تاریخ کا نہایت قابل فخر باب ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج بیشتر مسلم ممالک میں جھنڈوں کی پہچان اور "قومی" ترانوں کے ردھم پر تو بہت زور ہے مگر انھیں کبھی اس امر کی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ صدیوں پر محیط اپنے اس اثاثے کے وارث بن کر سامنے آئیں، اور عصبیت جاہلیہ سے قطع نظر سچائی کا کھوج لگانے کی کوشش کریں۔

کبھی کبھی کوئی فرزانہ کلمہ حق بلند کرتا ہے۔ ایسے فرزانے ہمارے کلمہ تحسین کے حق دار ہیں۔ ڈاکٹر عطاء اللہ گوپانسکی کی زیر تبصرہ کتاب بھی اسی اظہار صداقت کی ایک مستند، جامع اور منفرد کوشش ہے۔ گوپانسکی کا تعلق (جرمنی اور روس کے درمیان واقع) پولینڈ سے ہے۔ وہ کمیونسٹ عہد جبر میں مسلمان ہوئے تو قید وبند کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس نے ان کے "ذوق جرم" کو اور زیادہ بڑھایا۔ زیر نظر کتاب کا محرک تحریر، تلاش صداقت کا جذبہ ہے۔ کتاب کا ضمنی عنوان ہے: "مشرقی یورپ میں مسلمان، اور ان کے دوستوں اور دشمنوں کی ان کہی تاریخ"۔ اس کتاب میں گوپانسکی نے غیر جذباتی قلم، متوازن ذہن اور مشاق مورخ کی طرح بالخصوص پولینڈ، یوکرین، لتھوانیا، کریمیا اور بالعموم مشرقی یورپ میں اسلام کی آمد، اور اس کی راہ میں مزاحم قوتوں کا جائزہ لیا ہے۔ ہر بات اور ہر نکتے کو ثبوت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مصنف نے بلاواسطہ اور بالواسطہ بھی پولش زبان اور مشرقی یورپ کی دیگر زبانوں کے ماخذ کو کھنگالا ہے۔ انگریزی ماخذ سے تو بھرپور استفادہ کیا ہے۔

کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے، جن میں پندرھویں صدی عیسوی سے لے کر بیسویں صدی تک کے تاریخی مدوجزر کو خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ اسلام سے محبت رکھنے کے باوجود مصنف کا قلم یک رخے پن کا شکار نہیں ہوا، بلکہ وہ مسلمانوں کی کوتاہیوں کو بھی ساتھ ساتھ بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ وہ مشرقی یورپ میں یہودی، عیسائی گٹھ جوڑ، یورپ پر یہودیوں کی گرفت کو نہایت خوبی کے ساتھ

پیش کرتے ہیں ۔ سچی بات ہے کہ ہمیں چیچنیا میں اسلامی جہادی قوت کا اندازہ سب سے پہلے ٹالسٹائی کے ناول حاجی مراد سے ہوا اور پھر کرنل محمد حامد کی کتاب امام شامل سے ۔ اسی طرح ہم لوگ بوسنیا کے مسلمانوں سے بے خبر تھے ' اب یہ کتاب ہمیں خبر دے رہی ہے کہ یورپ میں مسلمانوں پر کیا گزری؟ مصنف نے دوسری جنگ عظیم کے واقعات کے پس منظر میں کارفرما استعماری قوتوں کا تار و پود بڑے مربوط انداز سے بکھیرا ہے ۔ مثال کے طور پر بولیلین کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں: ۱۰ فروری ۱۹۴۵ کو یالٹا کی ایک سابق مسجد میں امریکی صدر روزویلٹ نے اسٹالن سے پوچھا: کیا وہ فلسطین میں ایک یہودی ریاست کے قیام کی حمایت کریں گے؟ اسٹالن نے کہا: ہاں' لیکن آپ عرب کے بادشاہ ابن سعود کو کیا [جواب] دیں گے؟ روزویلٹ نے مسکرا کر جواب دیا: میں بطور رعایت انھیں صرف ایک پیش کش کر سکتا ہوں' اور وہ یہ کہ ابن سعود کو امریکہ میں موجود ساٹھ لاکھ یہودی پیش کر دوں ۔ ہرچند کہ اسٹالن یہودیوں کو مفاد پرست اور دلال کہا کرتا تھا لیکن اس نے روزویلٹ کے اس نظریے کی تائید کی 'کہ مشرقی یورپ اور جرمنی کے یہودیوں کو بھی فلسطین بھیج دیا جائے'' ۔ (ص ۲۸۸)

گوپالسکی نے اس کتاب میں گزرے ہوئے لوگوں کا نوحہ بیان کرنے کے بجائے تاریخ اور اس کے فراز میں موجزن زیریں لہروں کو بے نقاب کیا ہے ۔ جس میں کلچر' روایت اور تاریخ روح عصر کے ساتھ ساتھ چلتے دکھائی دیتے ہیں ۔ مصنف نے نہ صرف پرانے ریکارڈ اور دستاویزات سے استفادہ کرتے ہوئے ان کی خوب چھان پھٹک کی ہے ۔ تصویروں' گرافوں' نقشوں' منتخب کتابیات اور مفصل اشاریے نے کتاب کی اہمیت کو دوچند اور قاری کے لیے عام فہم بنا دیا ہے ۔ ڈاکٹر انیس احمد کا دیباچہ کتاب کا بہترین تعارف ہے ۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ اس کتاب کو اردو' عربی' فارسی اور ترکی زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے ۔ (سلیم منصور خالد)

Teachers' Training: The Islamic Perspective ' ڈاکٹر ایم ظفر اقبال ۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' اسلام آباد ۔ صفحات: ۲۲۰ ۔ قیمت: درج نہیں ۔

امت مسلمہ اپنی تقدیر کی تلاش میں جو جہاد کر رہی ہے اس کے کسی نہ کسی منظر کی جھلکیوں سے بین الاقوامی نیٹ ورک کا کوئی خبرنامہ خالی نہیں ہوتا ۔ لیکن ایک دوسرا منظر کسی بھی مسلم آبادی کا وہ کلاس روم ہے 'جہاں ایک استاد اپنے طالب علموں کی علمی تشنگی کو تسکین دیتا ہے اور چاہے نہ چاہے 'اس کی سیرت و کردار کو ایک رخ دیتا ہے ۔ نئی نسل کو زندگی کے حقیقی مقصد سے آشنا کر کے زندگی کے میدان میں داخل کرنا 'ایک مسلم استاد کا اصل امتحان ہے ' لیکن ایسے مسلمان استادوں کی تربیت اور تیاری کا کوئی نظام مسلمانوں کے اتنے بہت سارے آزاد ممالک ہونے کے باوجود کہیں کام نہیں کر رہا ہے ۔

جہاں پورے کا پورا نظام تعلیم مغرب کا ورثہ ہے اور اب بھی مغرب سے ہی بلاسوچے سمجھے اخذ و قبول جاری ہے، وہاں اساتذہ کی تربیت کا نظام اس سے مستثنیٰ کیوں ہو! اب تو یونیسکو ہی نہیں، ورلڈ بنک اور ایشین بنک تک مسلم ممالک کی تعلیمی حکمت عملی طے کرنے لگے ہیں اور این جی او کے پردے میں اساتذہ کے تربیتی ادارے قائم ہو رہے ہیں۔

اس پس منظر میں، ڈاکٹر ظفر اقبال کا زیر نظر، ڈاکٹریٹ کا مقالہ ان ملکوں اور اداروں کے لیے راہ کشا ہے جو ۲۱ ویں صدی میں مسلمانوں کی تقدیر کی بازیافت کے لیے نئی نسل کی تیاری میں استاد کے کلیدی کردار سے آگاہ ہوں۔ فاضل محقق نے موضوع کے تمام پہلوؤں کا بخوبی احاطہ کیا ہے اور ہر نکتے پر پیشہ ورانہ اور علمی بحث کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے میدان میں یہ ایک غیر معمولی کام ہے اور انگریزی میں ہونے کی وجہ سے نہ صرف مسلم دنیا کے پالیسی سازوں کے لیے دستیاب ہے بلکہ مغرب کے ماہرین تعلیم کے لیے بھی، جو اسلام میں دلچسپی رکھتے ہیں، قابل قدر ہے۔

کتاب کے آغاز میں علم، خدا، انسان، کائنات، اقدار اور معاشرے کے اسلامی تصور کو اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک باب میں اسلامی نظام حیات میں تعلیم کے مقام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد استاد اور تدریس کے موضوع پر قدیم مسلم مفکرین کے خیالات کی مدد سے استاد کے منصب کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ اگلے باب میں دنیا کے کئی ممالک مثلاً چین، انڈونیشیا اور سویڈن میں اساتذہ کے تربیتی اداروں کے نظام کا جائزہ لیتے ہوئے مفید نکات اخذ کیے گئے ہیں۔ آخری ۱۲۵ صفحات میں تفصیل سے، جزئیات میں جاکر، ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کر کے اساتذہ کی تربیت کا مجوزہ ماڈل پیش کیا گیا ہے جو مصنف کا اصل کارنامہ ہے۔ اس کی تیاری میں ان کی محنت کی حقیقی داد تو یہ ہے کہ کوئی ادارہ یا ملک اس ماڈل کو اختیار کرلے۔ ہمارے ملک کے ماہرین تعلیم کو نہ صرف اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے بلکہ جو افراد اساتذہ کے تربیتی اداروں کے ذمہ دار ہیں انھیں اپنے لیے اور اپنے زیر تعلیم اساتذہ کے لیے اس کتاب سے رہ نمائی لینے میں کسی سرکاری اجازت کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔

(مسلم سجاد)

مجلہ اردو بک ریویو، مدیر: اسرار عالم۔ پتا: ۱۷۳۹/۳ بیسمنٹ، نیو کوہ نور ہوٹل، پٹوڈی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔ صفحات: ۶۴۔ سالانہ چندہ برائے سارک ممالک: ۲۰۰ روپے۔ دیگر ممالک ۱۲ ڈالر۔

ہر ماہ پاکستان اور بھارت (بلکہ ایک حد تک کئی دیگر ممالک) میں مختلف علوم و فنون سے متعلق سیکڑوں کتابیں چھپتی ہیں مگر اردو قارئین اکثر نئی کتابوں کی آمد و اشاعت سے بے خبر رہتے ہیں۔ مختلف رسائل و جرائد تبصروں کے ذریعے نہایت محدود تعداد میں کتابوں کو متعارف کراتے ہیں۔ زیر نظر مجلہ

اس کمی کو پورا کرنے کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ زیر نظر شمارے کا تقریباً نصف حصہ بعض علمی و اشاعتی موضوعات پر مشتمل ہے اور باقی حصے میں کتابوں پر تبصرے، خبریں اور نئی کتابوں کی فہرست شامل ہے۔ تبصروں کے ۱۰ صفحات (۱۵ کتابیں) کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔ (بک ریویو میں "ریویو" کا حصہ غالب نظر آنا چاہیے) دو چار اہم تر کتابوں پر تفصیل کی اطلاعات، مع فہارس مضامین، ریویو آرٹیکل آنے چاہییں۔ اسی طرح اردو رسائل و جرائد کی تازہ اشاعتوں کی اطلاعات بھی شائع کی جائیں۔ خبروں کا حصہ بھی دلچسپ ہے۔ یہ خبر درست نہیں کہ "بال جبریل" کا کوئی انگریزی ترجمہ ابھی تک نہیں چھپا (ص ۴۶) سید اکبر علی شاہ کا ترجمہ غزلیات "بال جبریل" لاہور سے ۲ بار چھپ چکا ہے۔ امید ہے دنیائے مجلات اور علمی حلقوں میں اس کا خیر مقدم کیا جائے گا (ر - ہ)۔

سہ ماہی **The Quranic Horizons**، مدیر اعلیٰ ڈاکٹر ابصار احمد۔ پتا ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور، ۵۴۷۰۰۔ صفحات: ۷۲۔ قیمت: ۳۰ روپے۔

قرآن کے پیغام عمل کی اشاعت کے لیے مرکزی انجمن خدام القرآن کے اس انگریزی سہ ماہی رسالے کی پہلی اشاعت (جنوری ۹۶) میں چار انتہائی قیمتی مقالات پیش کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے نبوت کے مقاصد پر، پروفیسر بی ایچ صدیقی نے اسلام اور جدیدیت پر اور ایس کے ہاشمی نے فرقہ واریت پر فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا ہے۔

A wake up call کے عنوان سے ڈاکٹر احمد افضال نے معاشرے میں مرد اور عورت کے مقام کے بارے میں مغرب کے غلط تصور اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اخلاقی اور جنسی بحران کے حوالے سے اسلامی تعلقات کو نہایت فاضلانہ اور تحقیقی انداز سے پیش کیا ہے۔ آج مغرب جن حالات سے پریشان ہے، ہمارے ذرائع ابلاغ معاشرے کو اسی طرف لیے جا رہے ہیں، اس لیے جاگنے اور مستعد ضرورت ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک معیاری مجلہ ہے۔ امید ہے کہ اس کی اشاعت باقاعدگی سے جاری رہے گی اور انگریزی پڑھنے والوں کو ایسی معیاری تحریریں فراہم ہوں گی جو انھیں قرآن کے حقوق ادا کرنے پر ابھاریں گی۔ اپریل تا جون کا دوسرا شمارہ بھی بعض عمدہ مضامین کے ساتھ منظر عام پر آگیا ہے (م - س)۔

سید لطف اللہ 'کراچی

شہنشاہ اور قزاق کی کہانی (جون ۹۶) آپ نے خوب بیان کی ہے۔ آپ نے دنیا کا ہر کام صیہونی سازش کے تحت انجام پانے کے نظریے کو مسترد کر کے بڑا اچھا کیا ہے۔ امریکہ کے یہودیوں کی مٹھی میں ہونے کو بھی بڑے اہتمام سے پیش کیا جاتا ہے۔ آپ نے درست موقف پیش کیا ہے کہ امریکہ دراصل اپنے ہی مفادات کے لیے کام کر رہا ہے' یہودیوں کے نہیں۔ ہماری قومی نفسیات بھی سازشوں کو اور دشمنوں کو ذمہ دار قرار دے کر خود پاؤں پسار لینے کی بن گئی ہے۔

سید ندیم احمد 'سکھر

"خطوط مودودی" کا مطالعہ (جون ۹۶) ہمیں سید مودودی کے دور میں واپس لے جاتا ہے اور ہم کچھ لمحات ان کے ساتھ گزارتے ہیں۔ اس خوش گوار تجربے کے لیے ہم پروفیسر خورشید احمد کے ممنون ہیں۔

محمد اسحق 'کوئٹہ

معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان کی قسمت طالبان کے ہاتھ آگئی ہے (نئی امیدیں' نئے خطرات جون ۹۶)۔ معاہدہ پشاور کے موقع پر پاکستان اور ملت اسلامیہ کے مفادات سے غداری کی سزا اہل پاکستان اور افغانستان آج تک بھگت رہے ہیں اور ابھی آیندہ نسلیں بھی اس کی قیمت ادا کریں گی۔ دعا ہے کہ حکمت یار ربانی معاہدہ مستقبل کی بنیاد بن جائے۔

ڈاکٹر رشید احمد 'نوشہرہ

امریکہ اور اسلامی تحریکات (مئی ۹۶) ہم سب کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ اس میں تشدد کے حوالے سے اخوان المسلمون اور جماعت اسلامی پاکستان کا موازنہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ حکومت نے جماعت پر ظلم و ستم مصری حکومت کی طرح نہیں کیا اس لیے جماعت نے تشدد کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ جماعت اسلامی پاکستان کے متشدد نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس پر دور ابتلا نہیں آیا۔ جماعت کے بانی امیر سید مودودی کو یہ ابتلا تختہ دار تک لے گیا۔ مرکزی شوریٰ کے تمام ارکین نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ڈاکٹر نذیر شہید اور اللہ بخش شہید نے جام شہادت نوش فرمایا۔ جماعت کے تشدد اور انتہا پسند نہ ہونے کی

وجہ یہ ہے کہ داعی تحریک سید مودودی نے پرامن اور جمہوری طریق کار اپنانے کی ہدایت کی تھی - یہ بات جماعت کے دستور میں مرقوم ہے اور آج تک جماعت اس پالیسی پر عمل پیرا ہے -

سرفراز حسین ' فیصل آباد

"کیا عدالتی فیصلہ ایک انقلاب کا نقیب بنے گا" (مئی ۹۶) میں آپ نے سپریم کورٹ کے فیصلہ کو مستحسن قرار دیا ہے' جب کہ اس فیصلہ کی رو سے وفاقی شرعی عدالت جو پہلے ہی سپریم کورٹ سے کم تر درجے کی عدالت سمجھی جاتی تھی' اسے احترام کے لحاظ سے بھی اور قانونی طور پر بھی ہائی کورٹ سے بھی کم تر عدالت قرار دیا گیا ہے - وفاقی شرعی عدالت کی تو پہلے بھی کوئی ایسی قدر و منزلت نہیں تھی مگر اس فیصلہ نے تو رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہے -

اعزاز الرحمان ملک ' بہاول نگر

آپ نے مارچ کے شمارے میں اسلام اور مغرب کے حوالے سے سلسلہ وار اظہار خیال کا ارادہ ظاہر کیا تھا - حالات حاضرہ (دہشت گردی' عدالتی فیصلہ) اشارات کا موضوع بن جاتے ہیں - ہم اس سلسلے کے منتظر ہیں -

محمد طاہر ہاشمی ' دھیرکوٹ آزاد کشمیر

اسلام کی پکار' اتحاد امت از مفتی محمد شفیع (جون ۹۶) بہت اچھی پیش رفت تھی - احیاے اسلام کے لیے دور حاضر کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے کہ امت محمدیؐ کو مسلک کے جھگڑوں سے نکالا جائے جنھوں نے مسلمانوں کو نزع میں مبتلا کر دیا ہے - مسلمان باہمی افتراق و انتشار کی وجہ سے عالمی طاغوت کے سامنے بے بس ہیں - اگر یہی قوت ایک دفعہ پھر اکٹھی ہو جائے تو آج کے قیصرو کسریٰ کو ان کے تخت سے محروم کر سکتی ہے -

یوسف حبیب ' کراچی

آج امت مسلمہ کو آپ جیسے دردمند دانش وروں کی ضرورت ہے - جنوری تا جون ۹۶ کے اشارات ایک کورس کی طرح پڑھ کر راہ عمل اختیار کرنا چاہیے تاکہ اللہ کی نصرت آئے اور مسلمان غالب ہوں - آپ اور آپ کے رفقا جو کام کر رہے ہیں' اللہ اس کی جزا دے -

محمد یونس جاوید ' سکرنڈ

میری آپ سے گذارش ہے کہ آپ مضامین میں آسان اور عام استعمال میں آنے والے الفاظ استعمال کیا کریں' ثقیل الفاظ کا استعمال نہ کریں - آپ کو ہمارے ملک کی تعلیمی حالت کا اندازہ ہے ہی' خصوصاً صوبہ سندھ کی حالت کا - ترجمان کو ایسا بنائیں کہ میٹرک پاس طالب علم بھی آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکے -

---

بیرونِ ممالک ترجمان القرآن حاصل کرنے کے لیے رابطہ پتے:

MAKTABA KULLIAH ALHINSAH
JAMIATUL MALAE ABDUL AZIZ
P.O.BOX 9027 JIDDAH
SAUDI ARABIA

SAIFULLAH SANAI
P.O.BOX 9178
DAMMAM 31413
SAUDI ARABIA

ADAAB BOOK SHOP
P.O.BOX 287
MANAMA
BAHRAIN

ANAYAT HUSSAIN GHAURI
P.O.BOX 382
ABU DHABI
UAE

MANZOOR ILAHI
P.O,BOX 621
DUBAI
UAE.

MR.MUHAMMAD SALAHUDDIN
DARUL SAUDIA JAUHARIA
AL BAGHDADIA BUILDING
P.O.BOX 2043
JEDDAH-21451

UMER ABDUL AZIZ
755-EAST 9 STREET#.B.6.
BROOKLYN
NEW YORK-11230(U.S.A)
✆ (781)421-5428

ISLAMIC BOOK CENTER
120,DRUMMOND ST.
LONDON N.W.I 2HL
UK.

UK ISLAMIC MISSION
121,OAKLAND ROAD HANWELL
LONDON W7 2DT
UK.

UK ISLAMIC MISSION
401-403,ALUM ROCK ROAD
BIRMINGHAM B-8 3DT
UK.

UK ISLAMIC MISSION
19- CARRINGTON STREET
GLASGOW G4 9AJ
UK.

UK ISLAMIC MISSION
1 TYDFIL PALACE
ROTH PARK CARDIFF
SOUTH WALES UK.

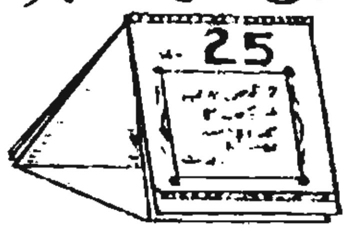
SYED SHAUKAT ALI
DEPT. OF COMMUNICATIONS
INTL.ISL.UNI. P.O.BOX 70
JALANJAN 46700-PJ SELANGER
MALAYSIA

RAFAY SAMAN
423,BARA MUGH BAZAR
ELEPHANT ROAD DHAKA
BANGLA DESH

دیگر ملکوں میں بھی خواہشمند رابطہ کریں:

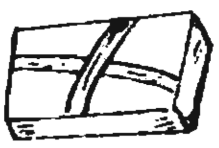
مینیجر ترجمان القرآن، ۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور 54600 فون 042-7587916

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک 'اچھرہ' لاہور سے شائع کیا


25







REGD. NO. L 5340 PHONES : 7587916
7585590

MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE